بسلسلۂ مطبوعات پاکستان حسینی مشن
راولپنڈی

اہل بیت اور اسلام

مصنفہ

حضرت شمس الواعظین ادیب اعظم مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ

نقوی امروہوی

قیمت آٹھ آنے

تعداد ۱۰۰۰

پیش لفظ

پاکستان حسینی مشن راولپنڈی کاغذ کی نایابی اور دیگر کئی دشواریوں کے باوجود قلیل سی مدت میں چار کتابیں اور دو مختصر سے رسالے شائع کر چکا ہے۔ "اہلبیتؑ اور اسلام" مشن کی ساتویں پیش کش ہے۔

حسینی مشن کی مطبوعات محبانِ اہلبیتؑ میں کس قدر مقبول ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اسی ایک بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے پہلی کتاب بالکل ختم ہو چکی ہے، جسے دوبارہ چھپوانے کا انتظام عنقریب کیا جائے گا۔ اور باقی کتابیں بھی بہت کم تعداد میں رہ گئی ہیں۔

مشن کے سامنے علوم و فضائلِ اہل بیت علیہم السلام کی نشر و اشاعت کا وسیع پروگرام ہے اور اگر فضلِ ایزدی شاملِ حال رہا اور قوم نے اپنا

تعاون جاری رکھا تو وہ دن دُور نہیں جب جدید اندازِ فکر کے مطابق کافی مقدار میں بہترین مذہبی لٹریچر کم سے کم قیمت پر افرادِ ملّت کے ہاتھوں تک پہنچ سکے گا۔

دعا کیجیے کہ اراکینِ مشن اپنے بلند مقاصد میں کامیاب ہوں۔

ناظم شعبۂ نشر و اشاعت

پاکستان حسینی مشن

راولپنڈی

۱۳ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ مطابق ۹ مارچ ۱۹۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمد اللہ ونصلی علی خاتم النبیین وآلہ الطیبین

پیش گفت

سالِ گزشتہ میں نے ایک رسالہ "اہلِ بیتؑ کا احسان دینِ اسلام پر" لکھا تھا۔ جس کو "آل پاکستان حسینی مشن راولپنڈی" نے طبع کرا کے شائع کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ لوگوں کو بے حد پسند آیا اور میری محنت ٹھکانے لگی۔

چند ماہ کے اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اور لوگوں کی طلب باقی رہی۔ اگر کاغذ ملنے میں دشواریاں نہ ہوتیں تو اب تک سیکنڈ ایڈیشن شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہوتا۔

میری تحریر کے قدردانوں نے حصۂ ثانی لکھنے کا مطالبہ کیا۔ ان محرّکوں میں میرے وہ مخلص احباب بھی شامل ہو گئے جن کی فرمائش میں تاخیر میری قلبی تکلیف کا باعث بن گئی۔

ایک عدیم الفرصت اور کثیر المشاغل انسان کو ایسی ندامتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

تاخیر نے میرے اضطراب کا وزن بڑھایا اور ذمہ داری کا احساس تنگیٔ وقت پر غالب آیا۔

ہزار سوختے والا سر جو مختصر سی خدمت کر سکتا تھا ہدیۂ ناظرین ہے خدا کرے یہ ناچیز خدمت بھی قبولیت کی سند حاصل کر لے۔

من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

طالبِ دعا

سید ظفر حسن نقوی الامروہوی

۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء

اہلبیتؑ کا تعارف

اہلِ بیتؑ سے ہماری مراد وہ تیرہ ہستیاں ہیں جو نور ہیں، اوّلِ مخلوق ہوتے ہیں، طینتِ نورانیہ ہیں، عفت وعصمت ہیں، طہارتِ خاصہ ہیں، تقرّبِ ایزدی ہیں، اطاعتِ مطلقہ ہیں، ولایتِ خاصہ ہیں اور تحریمِ صدقہ ہیں، رسولؐ کی سہیم وشریک ہیں۔ یعنی جناب فاطمہ زہراؑ اور بارہ امام، جن کے اوّل حضرت علیؑ اور آخر امام مہدیؑ آخرالزماں ہیں۔

ان میں چار بزرگ (علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ وحسینؑ) ایسے ہیں جنہوں نے

آغوشِ رسالتؐ میں پرورش پائی

وحیِ الٰہی کی آوازیں سنیں

فرشتوں کی آمدورفت دیکھی

علمِ رسولؐ سے ان کے سینے منوّر ہوئے۔

خدا ورسولؐ نے ان کے ہر عمل کی مدح فرمائی۔

قرآن نے ان کے فضائل کی قصیدہ خوانی کی۔

اہلبیتؑ کا روحانی اقتدار

اخلاقی فضائل اور روحانی کمالات کا آپ کوئی اونچے سے اونچا تصوّر کیجیے، بلند سے بلند منزل خیال میں لائیے۔ اہلبیت اپنے مراتب میں اس سے بالاتر ہونگے۔ ان کے دوستوں اور دشمنوں نے ان کے کتنے فضائل بیان کیے۔ اس کو جانے دیجئے۔ دیکھئے یہ کہ انھوں نے جو کہا اور جو کیا اس پر نہ کبھی خدا نے اعتراض کیا نہ رسولؐ نے۔ بلکہ ان کا ہر عمل سراہا گیا اور ہر بات کی تعریف ہوئی۔

اسی کا نام کمالِ فطرت ہے۔

قرآنِ مجید میں جتنی آیات انکی شان میں ملتی ہیں۔ کس کو نصیب۔ چاہے عہدِ رسالت کا کوئی کتنا ہی کامل الایمان اور مرتاض انسان کیوں نہ ہو۔

اسی کا نام پاکیزگیٔ نفس ہے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سونا کسوٹی پر کسا جاتا ہے
جواہرات نظر سے پرکھے جاتے ہیں
تزکیۂ نفس کے قدردان پاک باطن ہوتے ہیں
اویس قرنی روحانی دنیا کی کتنی عظیم المرتبت ہستی ہے۔ ارباب سلوک کو

رشاد نے امام طریقت مان لیا ہے۔ کشفِ باطن کا یہ حال تھا کہ جب آنحضرتؐ کے دندانِ مبارک اُحد میں شہید ہوئے تو اویس نے یمن میں یہ کہکر اپنے دانت توڑ لئے۔

"جب حبیبِ کبریا کے دانت نہ رہے تو میرے کیوں رہیں"

صفائے نفس کا یہ عالم تھا کہ آنحضرتؐ پر غائبانہ ایمان لائے تھے۔

ریاضت کا یہ حال تھا کہ عزلت نشیں ہوکر شب و روز عبادتِ الٰہی میں گذارتے تھے۔

رجوعِ خلق کی یہ کیفیت کہ سینکڑوں آدمی شوقِ زیارت میں دروازہ پر آتے اور ناکام چلے جاتے۔

پردۂ فانوس میں ہے شمع لیکن عشق نے
کتنے پروانوں کو کھینچا آستانِ یار تک

ایک دن مشتاقانِ دید کو پتہ چلا کہ اویس سرِراہ بیٹھے ہیں۔ دوڑ پڑے۔ پوچھا حضور آپ یہاں کیسے؟

کسی کے انتظار میں ہوں۔

آپ اور انتظار! وہ خوش نصیب کون ہے؟

وہی جس کے قدموں کی خاک اویس کی آنکھوں کا سُرمہ ہے۔ یہ علیؑ تھے جو جنگِ صفین کے لئے مع لشکر جا رہے تھے اور اویس کے لئے ایک علم پہلے ہی محفوظ کر لیا تھا۔

جناب سلمان رضی اللہ عنہ کا مرتبہ کون نہیں جانتا۔ کمالِ ایمان کا یہ عالم کہ رسولؐ نے اپنے اہلبیت میں لے لیا۔

السّلمان منّا اھلَ البیت

ان سے کسی نے پوچھا۔ آپ کی نظر میں علی کا مرتبہ کیا ہے؟ فرمایا "وہ نیکوں کے پیشوا ہیں، بدکاروں کے قاتل۔ متقیوں کے امام ہیں، مومنوں کے رہبر، خُدا کے ولی، رسولؐ کے نفس اور سلمان کے آقا و مولا"

دوستوں کا کیا ذکر دشمنوں سے ان کے روحانی فضائل چھپائے نہ بنی۔ کہا اور اتنا کہا جس کی امید نہ تھی۔

خوفِ طوالت پائے قلم کی زنجیر ہے۔ ورنہ دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔

اہلبیتؑ کے روحانی فضائل پرکھنے کا کوئی معیار صحیح ہمارے پاس نہیں۔ ایک اندھا اگر آفتاب کی تعریف کرے تو فرضی یا سماعی ہو گی۔ وہ کیا جانے اس کا وجود کتنا درخشاں ہے اور اس کی ضیا پاشی کی شان کیا ہے

ایک بہرہ انسان خوش آئند نغمہ کی کیا داد دے سکتا ہے اور اگر دے تو اس کی قدر و قیمت کیا۔

ہم رُوحانی دُنیا سے بہت دُور بستے ہیں کیا جانیں اس کے زمین و آسمان کیسے ہیں اور اس کی نورانی فضا میں سانس لینے والے کن کمالات کے مالک ہوتے ہیں۔

بہتر ہے کہ ہم چُپ ہو جائیں اور حضرت علیؑ کی زبان سے اہلبیتؑ کے

روحانی فضائل سنائیں۔

مَوضِعِ سِرِّہٖ	اسرارِ الٰہیہ کے محفوظ رہنے کی جگہ ہیں
وَلجَأُ اَمرِہٖ	حکمِ الٰہی کے پناہ لینے کا مقام ہیں
وَعَیبَۃُ عِلمِہٖ	علمِ الٰہی کا خزانہ ہیں
وَمَوئِلُ حِکَمِہٖ	خدائی حکمتوں کے رجوع کرنے کی جگہ ہیں۔
وکُھُوفُ کُتُبِہٖ	آسمانی کتابوں کے پناہ لینے کے لئے غار ہیں
وَجِبَالُ دِینِہٖ	خدائی دین کے پہاڑ ہیں
بِھِم اَقَامَ انحِنَاءَ ظَھرِہٖ	انکی وجہ سے دین کی ٹیڑھی پیٹھ سیدھی ہوگئی
وَاَذھَبَ ارتِعَادَ فَرائِصِہٖ	انکی وجہ سے دین کے کندھوں کی کپکپی دُور ہوئی
لایُقَاسُ بِآلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ من ھٰذہِ الاُمَّۃِ اَحَدٌ	آلِ محمدؐ کا قیاس اس امت میں سے کسی شخص پر نہیں ہوسکتا
وَلَا یُسَوّٰی بِھِم مَن جَرَت نعمتھم علیہ ابدا	ان کی برابر وہ شخص کیسے ہوجائے گا جس پر ان کے ہمیشہ احسان رہے ہوں
ھم اساسُ الدّین	وہ دین کی بنیادیں ہیں
وَعِمادُ الیقین	وہ یقین کے مستحکم ستون ہیں۔
الیھم یفیءُ الغالی	حد سے تجاوز کرنے والا انکی طرف لوٹ کر آتا ہے
وبھم یلحق التّالی	اور پیچھے رہ جانے والا انہی سے آکر ملتا ہے
ولھم خصائصُ حقِّ الولایۃ	ان میں ولایت کی تمام خصوصیات ہیں

وفیھم الوصیۃ و   رسُول کی وصیّت و وراثت انھی ہیں
الوراثۃ   ہے   (نہج البلاغہ)

ان فقروں میں جو سمندر موج زن ہے۔ اس کو صرف بصیرت کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔

واقعات اسلامی سے باخبر انسان۔ مدارج روحانیت سے آگاہی رکھنے والا اور انسانی کمالات کا راز دار ہی سمجھ سکتا ہے کہ چند فقروں میں کیا کیا کہدیا۔ بدذوق مسلوب الحواس کیا جانے کہ یہ منازل و مراتب کیا ہیں؟

اہلبیتؑ اور اسلام

اہلبیتؑ کو اسلام سے وہی تعلّق ہے جو
رُوح کو بدن سے
خوشبو کو پھُول سے
دل کو حرکت سے
صدف کو گوہر سے
نافہ کو مشک سے اور
نُور کو آفتاب سے ہے۔

یوں تو ہر کلمہ گو مسلمان ہے مگر حقیقی اسلام کبھی اور ہی بزم کا مسند نشین ہے۔

ایک لہکتے مہکتے چمنستان کا تصور کیجیے۔ اس میں کیا کیا ہے۔

پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں
عطر میں بسے ہوئے پھول
لہلہاتے سبزے
لچکتی شاخیں
رسیلے پھل
مگر اس کے پہلو میں ابھی کچھ اور بھی ہے
خاردار جھاڑیاں
بدبودار پھول
کڑوے پھل
سوکھے درخت
کمھلاتی گھاس

یہ سب باغ کی کائنات ہے۔ یہ سب زمینِ چمن کی مخلوق ہے۔ یہ سب ایک ہی بزم کے حاشیہ نشیں ہیں۔ لیکن ذوقِ سلیم سے پوچھیے۔ چمن کا لفظ سُن کر سب سے پہلے اس کے ذہن میں کیا چیز آتی ہے۔ اُس کا دل ان چیزوں میں سے کس کی طرف زیادہ کھنچتا ہے۔ کیا تحفہ وہاں سے لانے کو دل چاہتا ہے۔

پھول یا کانٹے؟

پس اسلام ایک تر و تازہ باغ ہے لہکتی مہکتی پھلواری ہے اور

اس کے کُل سرِ سبد اہلبیتؑ ہیں۔

اہلبیتؑ کا یہ پہلا احسان ہے کہ انھوں نے اسلام کی اصلی صورت کو اس طرح باقی رکھا کہ اس کا معمولی سے معمولی خط و خال بھی مٹنا تو کیسا اپنے رنگ میں دھیما بھی نہ پڑا۔

ایمان اور عمل صالح ۔ اسلام کا دوسرا نام ایمان اور عمل صالح ہے اور ان کے درمیان ایسا لزوم ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر مردود و نامقبول۔

ایمان کو عملِ صالح سے وہی نسبت ہے جو قرآن کو اہلبیتؑ سے۔ جس کسی نے صرف قرآن کو ذریعۂ ہدایت سمجھا اس نے حدیثِ ثقلین سے عداوت مول لی اور اپنی نجات کے گلے میں موت کا پھندا ڈالا۔

کتنی افسوسناک ذہنیت ہے اُس شخص کی جو دو آنکھوں کے بجائے ایک ہی چاہتا ہے۔

کتنا یتیم العقل ہے وہ انسان جو علم کو عمل سے جُدا کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتا ہے۔

اہلبیتؑ نے اپنے یقینِ کامل، اعتقادِ راسخ اور عملِ صحیح سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام معہ اپنے تمام کلیات و جزئیات اور اصول و فروع کے ان کے اندر جلوہ گر ہے۔

ہر وجود اپنے حدودِ سعی میں بقدرِ امکان نقصان سے کمال کی طرف جانا چاہتا ہے۔ بعض منزل تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض راستہ ہی میں دم توڑ بیٹھتے ہیں۔

کیا اہلبیتؑ کے سوا کچھ اور ایسی ہستیاں بھی آپ کی نظر میں ہیں جن کے دامنِ علم و عمل پر نقصان کا کوئی داغ دھبہ نہ ہو اور کمال ان کے وجود کا جزو لاینفک ہو۔ وہ کامل ہی پیدا ہوئے ہوں اور کامل ہی مرے ہوں؟

میں ان کے نام سُننا چاہتا ہوں۔

یہ کوئی ظنی مفروضہ نہیں، شاعرانہ مبالغہ نہیں، وہمی قیاس آرائی نہیں بلکہ ایک وزنی حقیقت اور ناقابل انکار صداقت ہے کہ اہلبیتؑ میں کسی زمانہ میں بھی بلحاظ ایمان و عملِ صالح کوئی کمزور پہلو نہیں پایا گیا۔

انکے پیکرِ علم و عمل کی رگوں میں ایسا خون دوڑا ہی نہ تھا جس میں نقصان کے جراثیم نے اپنا گھر کیا ہو۔

رزم ہو یا بزم منبر ہو یا مسجد، تونگری ہو یا تنگدستی، علمی صحبت ہو یا عملی میدان نکتہ چین کو ان کے کمالِ نفس اور حُسنِ عمل پر انگشت نمائی کا موقع ملا ہی نہیں۔

انکی زندگی کے واقعات میرے دعوی کا ثبوت ہیں۔ قرآن کو پڑھئے حدیثوں کو دیکھئے۔ ان کے ہر عمل پر آپ تصدیق کی مہر پائیں گے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ان کے احترام کو ایمان کا جزو بنا دیا۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس نے ان کی افضلیت کا اقرار دوست اور دشمن سب سے کراکے چھوڑا

آنحضرت صلعم کے بعد اگر اہلبیتؑ کا وجود نہ ہوتا تو اسلام کا حقیقی مجسمہ کہیں ڈھونڈا نہ ملتا اور دشمنانِ اسلام کو ایسے بہت سے گوشے مل جاتے جن میں وہ معترضانہ شان سے داخل ہو جاتے۔

کیا اسلام پر اہلبیتؑ کا یہ احسان نہیں ؟

اہلبیتؑ کی امتیازی شان

اسلامی تاریخ کے باخبر حلقے میرے اس بیان کی تصدیق کرینگے کہ عہدِ رسالتؐ کے تمام مسلمان کفر کو چھوڑ کر اسلام میں آئے تھے۔ کسی فردِ واحد کا دامن بُت پرستی کی آلائش سے پاک نہ تھا۔ پس یہ کھُلی حقیقت ہے کہ ان کی منازلِ حیات میں ضلالت و گمراہی کو دوڑ دھوپ کا موقع مل چکا تھا اور تزکیۂ نفس اپنی ارتقائی منازل میں آبلہ پائی کا ثبوت دے چکا تھا۔ ایسی صورت میں ندامت کا گردن جھکانا لازم ہے۔

عہدِ رسالتؐ کا کوئی مایۂ نازہ متّقی، قابلِ فخر مرتاض اور شہرۂ آفاق رہنما کیا یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میرے تمام اعمال کا نشو و نما اسلام کے مقدس سایہ میں ہوا ہے اور میرے کارنامۂ حیات میں حبطِ اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؟

اگر شوخ چشمی صداقت سے مُنہ موڑ کر ایسا کہے گی تو اس کے ماتھے پہ بُت پرستی کا نشان اس کے غلط دعوی کی تکذیب کے لئے کافی ہوگا۔

کون ذی عقل مان لے گا کہ جن اعمال کا صدور بحالتِ کفر ہوا ہوگا وہ ایمان باللہ و بالرسول کے بغیر قبول کی سند حاصل کر لیں گے۔

اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس کٹوتی اور منہائی کے بعد اعمال کا

ن کتنا باقی رہ جائے گا ؟ مہاجر ہوں یا انصار سب کی یہی حالت ہے ۔

اب ان کے مقابل ان لوگوں پر نظر ڈالیے جنہوں نے ان واحد کے لئے رک باللہ نہیں کیا ۔ جھوٹے کو بھی کسی بُت کے سامنے سر نہیں جھکایا ۔ خدا کے گھر ا پیدا ہوئے ، رحمتوں کی آغوش میں آنکھ کھولی ، ایمان کی چھاتی سے دودھ پیا اور لام کے سایہ میں پرورش پائی ۔

ان کے چہروں پر نورِ ایمان کی جھلک اگر روزِ ولادت سے نہ ہوتی تو لوگ ترم اللہ وجہہ کیوں کہتے ۔

اب دونوں گروہوں کو نظرِ اعتبار میں تولئے اور فضیلت کی سند ں کے ہاتھ میں آپ کا جی چاہے ، دے دیجئے ۔

کیا اہلبیتؑ کا اسلام پر یہ احسان نہیں کہ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ لام کی محبت فطرت کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح دوڑی ہوئی ہے ؟

اہلبیتؑ اور عصمت

حیاتِ انسانی کے ہر گوشہ پر نظر ڈالئے ۔ معصیت کی دلدل میں ہر س کم و بیش پھنسا ہوا ہے ۔ بلند سے بلند کردار والے بھی یہ کہتے جھجکتے ہیں کہ ہم ، کوئی ہلکا سا گناہ بھی سرزد نہیں ہوا ۔

ممکن ہے فریبِ نفس کا شکار ہو کر کوئی محسوس نہ کرے یا قوتِ تمیز وج ہو کر اپنے فرض سے غفلت کر جائے لیکن قریب سے دیکھنے والوں

کو پتہ چل جائے گا کہ گولے کے پیٹ میں کتنے جھنگے ہیں۔ زرق برق پوشاک کے نیچے کالے داغ دھبے کہاں کہاں ہیں۔

آپ کو جہاں تک گناہوں کی ہلکی یا بھاری چھینٹیں اڑتی نظر آئیں سمجھ لیجئے ایمان کسی مرض کا شکار ہے، یقین کے اعضا مفلوج ہیں۔ انسان کو ضلالت کی تاریکی نے گھیر لیا ہے۔ اور خدا کے سمیع و بصیر و قہار و جبار ہونے کا یقین دل کے پردہ میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ ورنہ گناہ پر جرأت کیوں؟

جس دل کے اندر یہ تاریکی نہ ہو، جہاں یقین محکم کے ساتھ ایمان ہر گوشہ روشن ہو، وہیں عصمت کی منزل ہے، وہیں کمالِ انسانیت کا مقام ہے۔

ہر فردِ انسانی میں گناہ کی رغبت اور معصیت سے محبت یا چیونٹی کی طرح رینگ رہی ہے یا وحشی ہرن کی طرح دوڑ رہی ہے۔ یعنی نقصانِ نفس کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ پھر بتائیے کمال کہاں روپوش ہے؟

تو کیا کمال کے وجود کا منکر ہو جانا چاہیئے؟ کیا کھلے لفظوں میں کہہ دینا چاہیئے کہ کمال ایک لفظِ بے معنی ہے، ایک خوابِ بے تعبیر ہے اور اس کا مصداق دنیا میں عنقا کی طرح معدوم ہے؟

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ایسا کہہ تو سکتے ہیں مگر قادر و قیوم ذات کی صنعتِ کاملہ پر حرف آئے گا۔ کیا فطرت یہ سوال نہ کر بیٹھے گی۔

"اگر خدا کامل ذات پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو اس نے پیدا کی کیوں

اگر عقل یہ جا بد ہی کرے کہ وہ ضرور اس پر قادر ہے تو جواب الجواب ہوگا کہ اگر اس نے ایسی مخلوق پیدا کی ہے تو بتاؤ اور دکھاؤ۔ ورنہ

دعوائے بے دلیل قبولِ خرد نہیں

اس سوال کے جواب میں آپ رسولؐ اور انکے اہلبیتؑ کو پیش کیجیے اور معترض سے کہہ دیجئے کہ ان کے دفترِ حیات کا ایک ایک ورق بلکہ ایک ایک لفظ پڑھئے، غور سے پڑھئے اور بتائیے کہ غلطی کہاں ہے؟

یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے دامنِ عمل پر گناہ کی ہلکی سی چھینٹ بھی ڈھونڈھی نہ ملے گی۔

ادیانِ عالم کی لمبی چوڑی اسٹیج پر صرف اسلام ہی ببانگ دہل یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ

میرے سایہ میں وہ مقدس وجود ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں جن کے عصمت مآب پیکروں تک معصیت کا ہلکا سا ذرہ بھی اڑ کر نہیں جا سکتا۔

یاد رکھئے یہ امتیازی شان صرف اسلام ہی کو حاصل ہے اور مسلمانوں میں صرف اہلبیتِ اطہار کو

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اہلبیتؑ اور تحفظِ اسلام

آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب کا شعور و احساس غفلت کی نیند سو رہا تھا اور بداخلاقی جذبات میں طوفان اٹھا رہی تھی۔

حضورؐ نے انہیں اس طرح جھنجھوڑا کہ بند آنکھیں کھل گئیں۔ قدیمی عداوت، محبت سے، جہالت، علمیت سے، وحشت، شائستگی سے اور بت پرستی، خدا پرستی سے بدل گئی۔

توحید کے انجکیشنوں نے کفر و شرک کا زہر رگ رگ سے نکال باہر کیا اور صدیوں کی تہ بتہ تاریکیوں میں دبی انسانیت امن و امان اور ایمان و عرفان کی فضا میں پھر سانس لینے لگی۔

اسلامی احکام بجلی کی رَو بن کر دل و دماغ میں دوڑ رہے تھے اور بھولے بھٹکے مسافر جادۂ عمل پر تیزی سے قدم اٹھائے چلے جا رہے تھے کہ شعبدہ بازِ فلک نے ایک نئی چال چلی جس سے یکایک ہادیِ عالمؐ کا سایہ مسلمانوں کے سر سے اٹھ گیا۔

ایمان کی نبضیں چھوٹنے لگیں، اور فرزندانِ توحید کے خون سے یقین کی گرمی ہلکے ہلکے نکلنی شروع ہو گئی۔ عقاید بد فوق ہونے لگے اور دستِ پائے عمل مفلوج، مخالفینِ اسلام نے وہ معجزنما چڑھاؤ اور یہ حیرت انگیز اتار دیکھ کر زبانِ طعن کھولی اور طرح طرح کی باتیں کہنی شروع کر دیں۔

اسلام مضطرب تھا اور ایمان بدحواس مسلمانوں کے دامنِ عمل کا ایک ایک تار جل رہا تھا اور اعتقاد کے باغ کا ہر پھول مرجھایا پڑا تھا۔

قانونِ الٰہی اپنے عمل کرنے والوں کو ڈھونڈ رہا تھا، عامیانہ قیاس آرائیاں حقائق و معارف کے سینہ پر سوار تھیں۔ مسلمان بہت سے تھے۔ مگر روحِ اسلام اپنے قالب چھوڑ چکی تھی۔ توحید کو کفر و شرک کے سانچوں میں ڈھالا جا رہا تھا اور ہدایت کے دروازوں پر ضلالت کے قفل لگتے چلے جا رہے تھے۔

مسلمانوں کے دلوں میں مرض تھا اور روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر ان معالجوں کی طرف کون رجوع کرتا جن کے ہاتھوں میں شفا تھی، جن کی ٹھوکروں میں جاں بخشی کا اثر تھا۔

دُنیا پرستی کی محبت نے دین کی محبت دلوں سے اس طرح نکال دی تھی کہ اسلام اپنی پناہ کی جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

اس نازک دَور میں اسلام کی نظر اُٹھی تو انہی ہستیوں کی طرف جو اس کی نصرت میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کی ٹھانے ہوئے تھے۔ جو تن من دھن سے آج تک اس کی مدد کرتے چلے آئے تھے۔

یہ اسلام کے بہادر شہ زور اور سچے مددگار وہ لوگ تھے جن کے دامن سے رسُول نے مسلمانوں کی نجات باندھ دی تھی جن کی محبّت و مودّت کو خدا نے واجب کیا تھا۔ جنہوں نے ہتیلی پر سر رکھ کر بہبودیٔ اسلام کے لئے کفار و مشرکین سے جنگ کی تھی جنہوں نے اپنے مُنہ سے لقمے نکال کر بھوکوں کو کھلائے تھے۔

دیکھئے وہ کس آن بان سے کس شان و شوکت سے آگے بڑھتے ہیں اور اسلامی قوانین کی حفاظت اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ وہ اپنے کو دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرکے یہ چیلنج کرتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے اگر ہمارا قدم بال برابر ہٹا ہوا ہو تو بتا دو۔ ہم وہی کر رہے ہیں اور عمر بھر کرتے رہیں گے جس کی ہدایت ہم کو خدا اور رسول نے کی ہے۔

دنیا بھٹکتی ہے بھٹک جائے۔

نمائشی دینداری ہوس پرستی کے سیلاب میں بہتی ہے بہ جائے۔

ہم ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ طاقتور بازو ہمیں ہلا ڈلا کر دیکھیں۔ فولادی پہاڑ ہٹ سکتے ہیں مگر ہم ایک اینچ جگہ سے نہیں ہٹ سکتے۔

تاجِ شاہی ہمارے سر پر رکھ کر دیکھو سلطنت کے بھرپور خزانے ہمارے تصرف میں دیکر دیکھو۔ تن آسانی اور جاہ طلبی ہمارے فقر پسند دل میں ہلکی سی گدگدی بھی پیدا نہیں کرسکتی۔

ہم تختِ سلطنت پر بھی وہی زہد نواز و تقویٰ پرست ہیں جو صحیفہ فقر و قناعت پڑھے۔ ہم بادشاہ بن کر بھی لباس میں پیوند لگانے والے اور جَو کی سوکھی روٹیاں کھانے والے ہیں۔ ہماری راتیں عبادت سے مخصوص اور دن خدمتِ خلق کے لئے وقف۔

اہلبیتؑ کے علمی خدمات

عرب کے وہ وحشت نژاد بدو جن پر صدیوں سے ضلالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور جن کے تمدن کے گوشہ گوشہ میں جہالت کا دور دورہ پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کی بدولت مسلمان تو ضرور ہو گئے تھے مگر اسلام کے فیض و برکات سے قطعاً محروم تھے۔ جن اساطیر الاولین اور قصص پارینہ کو نسلاً بعد نسلٍ اپنے آباد اجداد سے سنتے چلے آرہے تھے۔ حقائق شناس نگاہیں انکی وقعت شیخ چلی کے افسانوں سے زیادہ نہ تھی۔ وہ شاعرانہ تخیلات تھے یا جاہلانہ قیاس آرائیاں جن سے کائنات کا کوئی عقدہ حل نہ ہو سکتا تھا۔

بعثت کے قریب تر زمانہ میں یونانیوں، ایرانیوں، رومیوں اور مصریوں کے جس فلسفے نے عرب کے دل و دماغ پر چھاپا مارا تھا۔ اس کو حقائق عالم سے لیا دیا ہی تعلق تھا۔ لایعنی مسائل پر ان کے تمام تر مباحث اچھی خاصی بھول بھلیاں تھے۔ جن میں انسانی دماغ الجھ کر اپنی عقل کو کھو بیٹھتا تھا۔ بالخصوص فلسفۂ الٰہیات، مابعدالطبیعات اور حیات بعدالموت وغیرہ کے متعلق جو قیاس آرائیاں کی گئی تھیں، اسلام کو ان سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

یہود و نصاریٰ نے جو اہلِ کتاب کہلاتے ہیں توریت و انجیل میں تحریف کر کے وہ شرمناک واقعات انبیاء و اولیا کے متعلق داخل کر دیئے تھے جن کو پڑھ کر عقلِ انسانی شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔

قرآن نے اس سفید جھوٹ کی قلعی کھولی اور صحیح واقعات بیان کر
انبیا کے دامنِ عصمت سے بدنما داغ دھبوں کو مٹایا۔ آنحضرت صلعم نے
کائنات کے بے شمار اسرار کی نقاب کشائی کی۔ توحید و نبوت، معاش او
معاد وغیرہ کے مسائل سمجھا کر بگڑے اعتقادات کو درست کیا۔ کھرے کھوٹ
میں تمیز کرائی۔

ابھی یہ نقوش اچھی طرح جمنے نہ پائے تھے کہ آنحضرت نے رحلت فرما
اور اسلام کے عروج کا زوال شروع ہوگیا۔ کفار و مشرکین کی فلاسوفی نے
عرب کے الھڑ دماغوں پر پرستش جادو مارا، جس سے وہ اپنا راگ چھوڑ
کر دوسروں کے گیت گانے لگے۔

کفار و مشرکین کے جاہلانہ رسم و رواج کا جو پھندا اسلام نے ان کی گردن
سے نکالا تھا وہ طوق بن کر پھر گلے میں آپڑا۔ نئے پودوں کا جڑ سے اکھاڑ
کون سا بڑا کام ہے۔ ایک جھٹکے میں باہر آتا ہے۔ یہی حال اسلامی تعلیم کا ہو
یہی وقت تھا جب یونانی اور ایرانی فلسفہ اسلامی سانچوں میں ڈھا
جا رہا تھا اور اسلامی اصطلاحوں کے پردہ میں مشرکوں کے عقائد کو چھپایا جا رہا
تھا۔ اس سلسلہ میں بے شمار عقیدے ایسے بن گئے جن کا پتہ نہ قرآن سے
ملتا ہے نہ حدیث سے مثلاً

(۱) خدا کا فاعلِ خیر و شر ہونا
(۲) خدا کا مجسم ہونا
(۳) خدا کا ہر شے میں در آنا (ہمہ اوست)

(۴) بندوں کا خدا سے مل جانا (وصال)

(۵) بندوں کا اپنے فعل میں مجبور ہونا۔

(۶) عدل خدا کے لئے ضروری نہ ہونا۔

(۷) کلام خدا کا قدیم ہونا۔

(۸) انبیا کا معصوم نہ ہونا

(۹) انبیا کے آباواجداد کا کافر ہونا

وغیرہ وغیرہ ایسے عقاید تھے جنھوں نے اسلام جیسے پاک دین کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

کیا بُرا وقت تھا کہ اسلامی عقائد مٹ رہے تھے اور لوگ دیکھ رہے تھے۔ کیسی عظیم الشان مصیبت تھی کہ مسلمانوں کی ایمانی رگیں کفر وشرک کا زہر چوس کر پھول رہی تھیں اور لوگ اُف نہ کرتے تھے۔ حقیقت اپنے مرکز سے دُور ہوتی جارہی تھی اور مسلمان خوش تھے۔ پھر بتایئے اس آئی بلا کو کس نے ٹالا؟

کیا ان لوگوں نے جو سلطنت وحکومت کی بے پناہ حرص میں وہ سب بھول گئے تھے جو ایک معقول انسان کو یاد رکھنا چاہیئے؟ کیا ان لوگوں نے جو عیش پرستی کی ہوس میں حق و باطل اور حرام و حلال کی تمیز کھو بیٹھے تھے؟

کیا ان لوگوں نے جو تسخیر ممالک کے شوق میں فوج کشی کے سوا اپنی زندگی کے تمام مقاصد فراموش کر گئے تھے؟

کیا ان لوگوں نے جنھوں نے دُنیا کے ہاتھوں اپنا دین بیچ ڈالا تھا؟

کیا ان لوگوں نے جنھوں نے مال وزر سے صندوق پُر کرکے اپنے دیرینہ فقر کو غنا میں تبدیل کر دیا تھا؟

کیا ان لوگوں نے جو بساطِ سیاست پر مکرو فریب کے مہرے لگائے بیٹھے تھے؟

کیا ان لوگوں نے جو فنِ آسانی کی فکر میں حقائقِ عالم پر فکر کرنے اور آیاتِ قرآنی میں تدبر کرنے کی قوت کو معطل بنا چکے تھے؟

نہیں نہیں۔ ایسا خیال بھول کر بھی نہ کرنا۔

بوریہ بافوں سے حریر سازی کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ مطربوں سے علمی مباحث کا تعلق نہیں ہوتا۔ مفلوج دماغ اور مدقوق ذہنیت ایسے مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔

سنئے اور غور سے سنئے۔

اس بگڑے وقت میں کام آنے والے، بھولی باتوں کو یاد دلانے والے، حق کو باطل سے جُدا کرنے والے وہی اہلبیتؑ تھے جن کو خدا کے برگزیدہ رسولؐ نے کتابِ خدا کے ساتھ قیامت تک کر دیا تھا۔ جو مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ کے مصداق تھے، جن کو قرآن نے "اہل الذکر" کہا۔ جن کو رسُولؐ نے اپنے شہرِ علم و حکمت کا دروازہ بتایا۔

انہوں نے اپنے خطبوں سے، اپنی مناجاتوں سے اپنے اشعار و اقوال سے فاسد عقیدوں کو درست کیا۔

الٰہیات کے مسائل سمجھائے۔

نبوت کی معرفت کرائی۔
حیات بعد الموت پر روشنی ڈالی
زندگی کے اصول بتائے
معاش و معاد کے عقدے حل کئے
اخلاقی فضائل کے گر سمجھائے
مخلوقات کے خصائص بتائے۔
آیاتِ قرآنی کی صحیح تاویلیں بیان کیں
احادیث کا صحیح مطلب بیان کیا۔

اگر زمانہ ساز گار ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ اہلبیت علیہم السلام کے فیوض و برکات کے کیسے کیسے چشمے اُبلے اور ہدایت کے کیا کیا ابواب کھلے۔

مگر آہ! یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کے بیان سے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ ظلم پسند سلاطین نے نیجفا پیشہ حکمرانوں نے بدکردار اور متعصب نام نہاد مسلمانوں نے کبھی ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کی بات کسی کو کان لگا کر نہ سننے دی۔ سختی کے ساتھ ان کو ہدایت سے روکا گیا۔ ان کی ہر حرکت و سکون پر کڑی نگرانی کی گئی۔ ان کے پاس آنے جانے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ مگر ایسے ناہموار اور صبر آزما دور میں بھی انہوں نے اپنی ہدایت کو نہ رکا اور وہ کیا جو کسی اور سے نہ ہو سکتا۔

اسلامیات کا تحفظ اہلبیتؑ نے کس شان سے کیا ہے۔ اس کے لئے نہج البلاغہ۔ صحیفۂ علویہ۔ درر و غرر۔ صحیفۂ کاملہ احادیثِ ائمہ تفاسیرِ اہلبیت وغیرہ دیکھے

اہلبیتؑ کی عبادت

اسلام نے ہر ایسی عبادت کو نظرِ اعتبار سے گرا دیا ہے جس میں رہبانیت کی شان پائی جائے۔

لا رھبانیۃ فی الاسلام (حدیث)

کیونکہ رہبانیت انسانی خلقت کی غرض و غایت کو پورا نہیں ہونے دیتی۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو مل جل کر رہنا ناگزیر ہے تاکہ ایک کی مدد سے دوسرے کا کام چلے۔

جن ادیان نے دینداری اور خدا پرستی کی بنیاد رہبانیت پر رکھی ہے انہوں نے فطرتِ انسانی پر کھلا ظلم کیا ہے۔

رہبانیت کی طرح انہماک فی الدنیا سے بھی اسلام نے روکا ہے کیونکہ اس سے طرح طرح کے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور رجوع الی اللہ کا موقع نہیں ملتا۔

اسلام نے اس افراط و تفریط کے بین بین اپنا راستہ قائم کیا ہے یعنی ترک و اختیار دونوں کو اس طرح سمویا ہے کہ تمدن و معاشرت کے اصول بھی برقرار رہیں اور خدا پرستی و دینداری کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

لیکن آنحضرت کی رحلت کے بعد یہ راستہ بھی صاف ستھرا نہ رہا بہت سی پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر نکل آئیں۔

کچھ لوگ تو یہودیوں کے احبار اور نصرانیوں کے راہبوں کی طرح لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے لگے اور تعلقاتِ دنیا پہ لات مار کر خانقاہوں اور مسجدوں کے گوشوں میں عزلت نشین ہو گئے اور کچھ دُنیا پرستی میں ایسے پھنسے جیسے شیرہ میں مکھی۔ ایسے ہی لوگ تعداد میں زیادہ تھے۔

مفلوک الحال عربوں کو اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں مالِ غنیمت جو کثرت سے ملا تو زہد و تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور عیاشی میں مبتلا ہو کر اسلامی تعلیم کو یک قلم فراموش کر بیٹھے۔ ایمان و عملِ صالح سے مُنہ موڑ کر مال و زر کے بندے بن گئے۔

اب وہ فقر پسند مسلمان نہ تھے بلکہ قیصر و کسریٰ کے شہزادے تھے، سکندر و دارا کے جانشین تھے۔

انھوں نے زہد و تقویٰ کی دلقِ کہنہ اتار کر سرمایہ داری اور ثروت پسندی کی پُر تکلف پوشاکیں پہن لیں۔ مٹی کے کچے جھونپڑوں کو آگ لگا کر زرنگار محلوں میں جا بیٹھے۔ حصیرِ قناعت کو لپیٹ کر مخمل و کمخواب کے فرشوں پر لوٹنے لگے۔

قرآن و حدیث کا درس بند ہو کر شاہدانِ ماہوش کے رقص اور مطربانِ خوش الحان کے نغمے جنت نگاہ اور فردوس گوش بن گئے۔ حسینوں کے جھرمٹ میں شرابِ ناب کے دَور چلنے لگے۔ حلال و حرام کی تمیز برطرف، حقوق النّاس کی حفاظت رخصت، احکامِ الٰہی وبالِ جان، نکوکاری و پاکبازی لفظِ بے معنی، ظلم و ستم مرغوبِ طبع، مکر و فریب دلیلِ دانشمندی، چالاکی اور فتنہ پردازی

مقصدِ زندگی۔
راتوں کی عبادت موقوف، تسبیح و تہلیل سے نفرت، غربا پروری سے چھٹکارا، خضوع و خشوع رخصت، انجام سے بے خبری، آخرت سے چشم پوشی غرض دینداروں کے حلقہ میں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو پکے دنیا داروں میں ہوا کرتا ہے۔
نفس پرستی اور ہوس رانی کی یہ تندو تیز آندھیاں قلمروِ اسلام کے ہر گوشہ میں اتنا گرد و غبار اڑا رہی تھیں کہ کسی کو آنکھ کھولنے کا یارا نہ تھا۔
اس طوفانِ بدتمیزی میں اس حدیث پر عمل کرنے کیلئے کون اٹھا؟

لیس منا من ترک الدنیا للاخرۃ والاخرۃ للدنیا	ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو دنیا کو آخرت کے لئے یا آخرت کو دنیا کے لئے چھوڑ دے

یہ رسولؐ کے اہلبیتؑ ہیں جو دنیا و آخرت دونو کو ملاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ نہ وہ رہبان تھے کہ پہاڑوں میں جا بیٹھتے نہ وہ ایسے دنیادار تھے کہ آخرت کو بھول جاتے۔
وہ ہر حالت میں شرعی واجبات و مستحبات کو پوری احتیاط سے عمل میں لا رہے ہیں اور اپنی کسی ذمہ داری کو خواہ دینی ہو یا دنیوی ترک نہیں کر رہے۔
علیؑ کے ہاتھ میں اسلامی حکومت کی عنان ہے۔ بیت المال پر ان کا قبضہ ہے۔ مگر نہ وہ اعراض عن الدنیا کے انتہائی مضرت رساں اصول پر عمل پیرا ہو کر احبار و رہبان کی سی زندگی بسر کرتے ہیں نہ انہماک فی الدنیا کی خوفناک

دلدل میں پھنس کر قیصر و خاقان کے مقلّد بنتے ہیں بلکہ اس اسلامی جادہ پر گامزن ہیں جو افراط و تفریط سے محفوظ ہے اور خدا و رسول کی پسندیدہ صراط مستقیم ہے۔

وہ بادشاہِ وقت ہیں مگر ان کے لباس میں پیوند لگے ہیں جَو کی سوکھی روٹی ان کے سامنے رکھتی ہے۔ وہی پرانا کھیس جو مدینہ سے ساتھ لائے تھے، ان کا سرمائی دوشالا ہے۔ بوریا ان کی مسند ہے۔ زمین ان کا فرش ہے اپنے حق سے زیادہ بیت المال سے ایک پائی نہیں لیتے اور جو لیتے ہیں وہ بھی بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان کو اپنے سے زیادہ غریب مسلمانوں کی فکر ہے۔ احکامِ اسلام کی ترویج زندگی کا سب سے پہلا مقصد ہے۔

وہ قائم اللیل اور صائم النہار ہیں مگر مشاغل سلطنت میں سرمو فرق نہیں۔ فرائض سے غفلت نہیں۔ اسی کا نام رسُول کی زندگی ہے۔

امام حسن علیہ السلام کو دیکھئے ناسازگار زمانہ کی معاندانہ رفتار اور بنی امیہ کی پُرفریب سازش نے چاروں طرف سے مصائب کے حلقہ میں لے لیا ہے۔ ملک میں ہر طرف بغاوت کی آگ بھڑک رہی ہے مگر کیا ان کی عبادت، ان کی توجہ الی اللہ ان کی حقوق شناسی میں کوئی فرق ہے؟ ہرگز نہیں۔

وہ اس پُرآشوب زمانہ میں بھی وہی حسنؑ بن علیؑ ہیں جو اس سے پہلے تھے

امام رضا علیہ السلام کو دیکھئے مامون رشید خلیفۂ عباسی نے ان کو اپنا

ولی عہد بنا لیا ہے۔ شاہی محلات کا ایک حصہ آپ کے لئے خالی ہو رہا ہے مگر آپ راضی نہیں۔ ایک معمولی سا مکان اپنی رہائش کے لئے تجویز کرتے ہیں اور ولی عہدی کا تمام زمانہ اسی میں گزار دیتے ہیں۔

سلطنت کے لایعنی مشاغل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ محافلِ رقص و سرود سے کوئی نسبت نہیں۔ دیکھئے وہ بوریئے پر بیٹھے تمام رات عبادتِ خدا میں بسر کر رہے ہیں احکام دین پر پوری پابندی سے عمل ہے ان کی زندگی کا ہر پہلو رسولؐ کی زندگی کی جیتی جاگتی یادگار ہے۔

بس یہی تین ہستیاں اہلبیتؑ میں ایسی تھیں جن کو دنیوی سلطنت سے تعلق رہا۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے نا ردا ماحول سے متاثر نہ ہوا اور مال و دولت کی گرمی ان کے روشن کردار پر اثر انداز نہ ہوئی۔ دنیوی آرام آسائش ان کی دینداری کے گلے کا پھندا نہیں بنے۔

یاد رکھئے! دُنیا کے اس خوفناک دَور میں صرف اہلبیتؑ رسولؐ ہی وہ سچے مسلمان تھے جنہوں نے دینداری اور خدا پرستی کی لاج رکھ کر اسلام کو نقطۂ عروج سے بال برابر نیچے نہ گرنے دیا۔

اہلبیتؑ کا زہد

اسلام کا زہد نہ رہبانیت ہے نہ سنیاس بلکہ وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بالکل ایک الگ چیز ہے۔ وہ ایسے زہد کا ہادی ہے جو باہمہ

اور بے ہمہ ہو یعنی

سب سے مل کر رہو اور سب سے الگ رہو

اس کی مکمل مثالیں آپ کو اہلبیتؑ ہی میں مل سکتی ہیں۔ ان کے سوانح حیات کا بغور مطالعہ کیجئے۔ امور خانہ داری میں، سازوسامانِ زندگی میں، طعام و لباس میں ان کی زاہدانہ شان سب سے نرالی نظر آئے گی۔

ان کی یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے اپنی ماندوبود کی روش اور ضروریات زندگی کو احتیاط کے اس آخری نقطہ پر رکھا تھا جس سے ایک ایک قدم نیچے اترنا فطرتِ انسانی کے گلا گھونٹنے کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے اپنے رہنے کے لئے ایسا مکان تجویز کیا جو سردی اور گرمی میں حفاظت تو کرے لیکن فخر و مباہات کا محرک نہ ہو۔ زیب و زینت کی تعریف سے اس کی حدود باہر ہوں۔

مٹی کے در و دیوار چند گز زمین گھیرے ہوئے، تعمیر کی سادگی کا نقشِ اولیں۔ کھجور کی لکڑی اور پتوں کی چھت صرف سایہ کی ذمہ دار۔ اتنی اونچی کہ سر سے نہ ٹکرائے۔ زمین پر بوریئے کا فرش۔ نہ تخت نہ کرسی۔ نہ مسند نہ چوکی۔ سب کی قائمقامی یہی بوسیدہ حصیر کر رہا ہے۔ وہی مصلےٰ ہے، وہی خوابگاہ دروازے پر پھٹے ہوئے کمبل کا پردہ۔ ایک کھال ہے جس پر اونٹ کھانا بھی کھاتا ہے اور رات کو سلطنت اسلامی کا مالک سو بھی رہتا ہے۔ لکڑی کا پیالہ پانی پینے کے لئے۔ مٹی کے دو ظرف کھانے کے لئے۔ ایک چکی اور چرخہ محنت سے روزی کمانے کے لئے۔ ایک ظرف آٹا خمیر کرنے کے لئے اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ ہے اہلبیتؑ کے گھر کا سامان۔ یہ ہے امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے راحت آرام کا سرمایہ حیاتِ زندگی کا کارخانہ۔

دُنیا والو! زندگی کے عیش کو نظر کے کانٹے پر تولنے والو! اور ہاتھ بڑھا کر ان میں سے کوئی ایک چیز کم تو کر دو۔

دیکھو اس سامانِ زندگی کا ایک اینچ نیچے اُتر آنا فطرت پر بار ہوگا اور اس سے ایک اینچ کے اُوپر جانا زہد کی حدود سے بڑھ جانا ہوگا۔

سبحان اللہ! کیا سیدھی سادی زندگی تھی۔

حیاتِ چند روزہ کی بسر اوقات کا سامان بھی اور حسابِ آخرت سے نجات بھی۔

جن لوگوں نے علائق کی زنجیریں کاٹ کر پہاڑوں کے غاروں میں زندگی گزاری، بھیک کے ٹکڑوں سے پیٹ پالا۔ بناسپتی کو دوزخِ شکم کا ایندھن ... کیا جانیں زہد کیا چیز ہے۔ ان کا وجود سوسائٹی پر بار۔ خود مطلبی ان کی زندگی کے ماتھے پر سیاہ داغ۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنے لئے۔ بنی نوع کو ان کی ذات سے کیا فائدہ۔

اہلبیتؑ علیہم السلام کا سامانِ زندگی کسی غریب سے غریب انسان کے دل میں بھی رشک و حسد کا جذبہ نہیں ابھار سکتا۔ محتاج سے محتاج انسان بھی حسرت بھرے لہجہ میں یہ نہیں کہہ سکتا۔

"کاش ہم بھی ایسے ہی ہوتے"

یہ عصمت بی بی از بے چادری والا مضمون نہ تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے

تھے۔ مگر کچھ نہ کیا اس لئے کہ اسلامی زہد کی شان دکھانا تھی۔

اب ذرا ان کے زاہدانہ لباس پر بھی ایک نظر ڈالئے

خاتونِ جنت کی چادر یا تقسیم نارو جناں کی عبا دونوں میں لیفِ خرما کے اتنے پیوند ہیں کہ اب نئے پیوند کی گنجائش نہیں۔ اس لباس میں ستر پوشی بھی ہے اور جسم کی حفاظت بھی۔ اگر انسان کی نظرِ انتخاب ایک تار برابر اُوپر جائے تو زہد کی تیوری پر بل پڑ جائیں اور اگر رہبانیت سے مانوس ذہنیت اس سے کم پر راضی ہو جائے تو فطرت اپنا سر پیٹ لے۔

کیا کوئی حریصِ زندگی راحت و آرام کا دلدادہ ایسے لباس کی طرف نگاہِ شوق اٹھائے گا؟ کیا وہ حسرت سے کہے گا۔

"کاش ایسا لباس میرے بدن پر بھی ہوتا"

اب ذرا اہلبیتؑ کی غذا پر بھی نظر ڈالئے

جَو کی روٹی کبھی تازہ کبھی باسی۔ کبھی نرم کبھی اتنی خشک کہ گھٹنے سے دبا کر توڑنے کی نوبت آئے۔ یہ نمک کے پانی میں گھول کر کھائی جاتی ہے اور خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔

کبھی روٹی کی جگہ وہ آٹا لیتا ہے جس میں آدھے سے زیادہ جَو کی بھوسی ملی ہوئی ہوتی ہے اور پانی کے سہارے اسے حلق سے اتارا جاتا ہے۔ دو غذائیں بیک وقت دستر خوان پر نہیں آتیں۔ اگر دودھ اور نمک جمع ہو جاتے ہیں تو دودھ پر نمک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

جب یہ غذا بھی میسر نہیں آتی تو قناعت اپنے پیٹ پر پتھر باندھنا

گوارا کرتی ہے مگر دستِ سوال کسی کے سامنے دراز نہیں کرتی۔

کوئی کہہ سکتا ہے یہ آئے دن کا فاقہ کیا۔ مالِ غنیمت کہاں جاتا تھا۔ محنت کی اُجرت صرف میں کیوں نہ آتی تھی۔ باغوں کی آمدنی کیوں نہ حاجت برآری کرتی تھی؟

اس کا جواب حضرت علیؑ کی زبان سے سُنیئے

کیف اشبعُ وحولی بطونٌ غرثیٰ

"میں کیونکر شکم سیر ہو کر کھاؤں جبکہ میرے گرد کچھ بھوکے پیٹ ہوں"

دیکھیئے یہ ہے قوتِ لایموت، اس سے کم ہیں ضررِ جان اور زیادتی میں نفس پروری۔

عسرت و تنگدستی کا کون سا مارا کچلا ایسا ہو گا جو حسرت سے کہے

"کاش یہ غذا میں بھی کھاتا"

اہلبیت اپنی زندگی کا کوئی رُخ ایسا بنانا چاہتے تھے جس سے بنی نوعِ انسان پر ان کو ناروا فخر کا موقع ملے یا ان کے نفس میں اپنی برتری کا تصور پیدا ہو۔

ان کے فخر کا کھلا میدان تقویٰ تھا، تقرب تھا، تزکیۂ نفس تھا، تصفیۂ باطن تھا۔ نہ کہ مال و دولت یا دنیوی ساز و سامان یہ سمجھئے کہ زمانہ نے انہیں ایسی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔ نہیں نہیں وہ اتنی آمدنی کے مالک تھے کہ راحت و آرام سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے صرف اس وجہ سے بھوکا رہنا گوارا کیا کہ محتاجوں کی حاجت روائی کر سکیں۔

وہ اپنی اس زاہدانہ زندگی سے نہ گھبراتے تھے نہ اکتاتے تھے۔ بلکہ اتنا ہی خوش تھے جتنا ایک جلیل القدر سلطان اپنے زرنگار محلوں میں الوانِ نعمت کھا کر اور لباس فاخرہ پہن کر۔

وہ محنت و مزدوری کو عار نہ جانتے تھے اور اس کے ذریعہ سے چند دانے خرمہ کے جو حاصل کرتے تھے وہ باوجود خود فاقہ سے ہونے کے بھوکے مسلمانوں کی نذر کر دیتے تھے۔

بتائیے۔ ایسی زندگی کی کتنی مثالیں دیندار مسلمانوں میں ملتی ہیں۔ ناقص مثالیں تو بہت سی مل جائینگی مگر کمال کی حد تو ڈھونڈی نہ ملے گی۔

اہلبیتؑ اور ایثار

دُنیا کی تاریخ میں ایثار کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر قوم اپنے اپنے ایثار کرنے والوں کو سراہ رہی ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ مگر جب اہلبیتؑ کے ایثار کے مقابل دوسروں کا ایثار رکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواہرات کے مقابل آبگینے، کوہ کے مقابل کاہ۔

قرآن مجید میں کچھ مخصوص ایثار کرنے والوں کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

"وہ اپنے نفسوں کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود تنگی میں ہوں"

اس کے مصداقِ خصوصی اہلبیت علیہم السلام ہی ہیں جس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) خدا کو صرف وہی ایثار پسند ہے جو لوجہ اللہ اور لحب اللہ ہو جس میں نہ تو نام ونمود کا شائبہ ہو نہ جزا و سزا کی تمنا۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا

"نہ ہم تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری"

ایسا ایثار اہلبیتؑ کے سوا کہیں ڈھونڈے نہ ملے گا۔

(۲) استغنا میں ایثار کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہیں لیکن تہیدستی اور پریشانی میں اپنے منہ کا لقمہ دوسروں کو دینے والے شاذ و نادر۔ یہ خصوصیت اہلبیتؑ ہی میں تھی کہ وہ خود بھوکے رہتے تھے اور دوسروں کو کھلاتے تھے خود پیوند دار لباس پہنتے تھے اور دوسروں کو نیا لباس پہناتے تھے۔

(۳) ایثار کرنے والے زیادہ تر دنیا میں ایسے ہی ہیں کہ اپنا احسان دوسروں پہ جتاتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جس سے دوسرے کا دل دکھے لیکن اہلبیتؑ میں یہ بات نہ تھی۔ انھوں نے کبھی کسی کو کچھ دے کر احسان نہ جتایا اور جو دیا وہ اس طرح کہ داہنے ہاتھ سے دیتے وقت بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔

اگر دنیا کی قومیں فخر و مباہات کے کسی اسٹیج پہ آکر اپنا اپنا ایثار پیش کریں تو اسلام ان سب کو شرمانے کے لئے صرف اہلبیتؑ کا ایثار پیش کر سکتا ہے۔

کیا یہ اہلبیتؑ کا احسان اسلام پر نہیں؟ اگر وہ ایسے نازک اوقات میں

جبکہ مسلمان انتہائی عسرت و تنگدستی میں اپنی اوقات گزاری کر رہے تھے اور روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے محتاج تھے۔ اہلبیتؑ غیر معمولی ایثار سے کام نہ لیتے تو بتائیے ان غریبوں پر کیا گزرتی۔

اہلبیتؑ کی سخاوت

سخاوت میں حاتم طائی سب سے زیادہ مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نے لوگوں کو بہت کچھ دیا مگر اہلبیتؑ کی اور اس کی سخاوت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ذرا دیر کے لئے آپ دونو کا موازنہ کیجئے۔

(۱) حاتم کی دست کشائی اور کرم گستری خواہ وہ کسی نقطۂ کمال تک فرض کر لی جائے، نمائش و نمود کے لئے تھی۔ اس سخاوت سے اس کا مقصدِ اولیں حصولِ شہرت و نیکنامی تھا۔ برخلاف اسکے اہلبیت علیہم السلام کا مطمحِ نظر دوسرا تھا۔ وہ جو کچھ دیتے تھے محض قربۃً الی اللہ دیتے تھے۔ سائل سے نہ کسی بدلہ کے طالب تھے نہ شکر گزاری کے۔ اہلِ حاجت کی تکلیف کا صحیح احساس ان کے جذبۂ سخاوت کو ابھارتا تھا۔

(۲) حاتم کی سخاوت علی الاعلان ہوتی تھی تاکہ لوگوں کی نظر میں اسکی شخصیت اپنے احترام کا ذہن پیدا کرے۔ اسلام ایسی سخاوت کا معترف و مداح نہیں۔

اس کے مقابل اہلبیتؑ کی سخاوت کو دیکھو وہ داہنے ہاتھ سے اس طرح

دیتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ پردۂ شب میں مُنہ پہ نقاب ڈالے ہوئے کسی مسکین محتاج کے دروازہ پہ دستک دیتے ہیں اور جب لینے والا آتا ہے تو خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اس طرح دیتے ہیں کہ لینے والے کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ دینے والا کون ہے کیا نام ہے اور کس شکل وشمائل کا انسان ہے۔

راز اس میں یہ تھا کہ لینے والے کو دینے والے سے آنکھیں چار کرتے ہوئے شرم نہ آئے۔ یہ تھی اسلامی سخاوت جسکی بہترین مثال اہلبیتؑ میں ملتی ہے۔

(۳) حاتم ایک متمول انسان تھا اپنی دولت لٹائے چلا گیا۔ اس کی سخاوت کا اثر اس کی ضروریاتِ زندگی پر کچھ نہ پڑتا تھا یعنی وہ دوسروں کو دیکر خود فقروفاقہ میں مبتلا ہوتا تھا۔ لیکن اہلبیتؑ جو کچھ کرتے تھے اکثر اوقات ان کو فقروفاقہ کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی تھی۔

بارہا ایسا ہوتا تھا کہ کئی وقت کے فاقہ کے بعد جو غذا ان کو میسر آتی تھی وہ سائل کو دینی پڑتی تھی اور خود بھوکے کے بھوکے رہ جاتے تھے۔

اہلبیت کی اس مخصوص سخاوت کی مدح قرآن میں موجود ہے اور یہی سخاوت اسلام کا طرۂ امتیاز تھی جس کو ہر زمانہ میں اہلبیت علیہم السلام نے باقی رکھا اور اقوامِ عالم کے اسخیاء سے اپنی اس اسلامی سخاوت کی داد لی۔

اہلبیتؑ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کوئی محتاج مسلمان کفار ومشرکین کا دستِ نگر نہ ہو اور اسلام کفار کی نظر میں سبک اور حقیر نہ بنے۔

(۴) کسی نے امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے حاتم کا ذکر کرتے ہوئے کہا وہ ایسا سخی اور جوانمرد تھا کہ ایک ہی سائل کو چالیس دروازوں سے دیتا تھا۔

فرمایا: وہ ایک ہی دروازہ سے اتنا کیوں نہ دیدیتا تھا کہ دوسرے دروازوں پر جانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی ؟

(۵) حاتم کی سخاوت سائل کے سوال کے مطابق ہوتی تھی اور اہلبیتؑ کی سخاوت سائل کی حالت اور ضرورت کے لحاظ سے۔ ایک روز ایک سائل مسجد میں آکر امیرالمومنینؑ سے عرض کرنے لگا۔ چار سو درہم کا مقروض ہوں۔ حضرت نے اس کو پانچ سو درہم ایک لباس اور ایک اونٹ عطا فرمایا۔

کسی نے عرض کی اس نے تو صرف چار سو درہم ہی مانگے تھے۔ آپ نے اتنا زیادہ کیوں دیا؟

فرمایا۔ چار سو درہم قرضہ ادا کرنے کے بعد وہ اپنے وطن جاکر کھاتا کیا؟ اس لئے سو درہم میں نے زیادہ کردئے تاکہ یہاں سے جاکر اپنے اہل و عیال میں چند روز تو خوشی سے بسر کرے۔ لباس اس لئے دیا کہ اس کے کپڑے بہت میلے اور بوسیدہ تھے۔ اونٹ اس لئے دیا کہ پیدل سفر کرنے سے اس کے پیروں پہ ورم آگیا تھا وطن تک جانا اس کے لئے دشوار تھا۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جن سے بہ آسانی یہ سمجھ میں آجائے گا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سخاوت کا معیار کچھ اور تھا اور حاتم کی نظر میں کچھ اور۔

اسلام نے اخلاقی فضائل کی جو عملی صورتیں دنیا کے سامنے پیش کیں وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اقوام عالم کے دائرہ عمل سے الگ ہی ایک چیز تھی۔ مسلمانوں نے اسلام کی ان عملی صورتوں کو اپنی خودغرضیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے ایسا مسخ کیا کہ لوگوں کی نگاہوں سے ان کی وقعت

گرگئی۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر اہلبیتِ رسولؐ نہ ہوتے تو ہر زمانہ میں اسلامی تعلیم کے سچے نمونے ملنے ناممکن ہو جاتے۔

اہلبیتؑ اور فضائلِ چہارگانہ

علمائے اخلاق نے اجناسِ فضائل چار چیزیں بیان کی ہیں (۱) حکمت (۲) عفّت (۳) عدالت (۴) شجاعت۔ ان کے تحت بہت سی انواع ہیں۔ ہم صرف اجناس کو مختصراً بیان کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اہلبیتؑ کا مرتبہ ان منزلوں میں کیا ہے۔

(۱) **حکمت**۔ حقائقِ اشیا کے صحیح علم کا نام حکمت ہے۔ حکمت وہ وسطی خط ہے جو افراط و تفریط کی حدود سے باہر ہو دو نقطوں کے درمیان ایک خط کھینچیے افراط  تفریط خطِ مستقیم یہ سب سے سیدھا اور سب سے چھوٹا خط ہے۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ اس کے فوق و تحت میں جو خطوط نکلیں گے وہ سب کج بھی ہونگے اور وسطی خط کی نسبت زیادہ لمبے بھی۔ اُوپر کے تمام خطوط افراط کی مختلف حدود ہونگی اور نیچے کے خطوط تفریط کی۔

حکیم وہ حقیقت شناس انسان ہوگا جو اپنے فکر و عمل میں نہ بال بھر افراط کی طرف جائے نہ تفریط کی طرف۔ بلکہ ٹھیک وسطی خط پر رہے۔ افراط و تفریط کے تمام خطوط رذائل کہلائیں گے اور بیچ کا خط فضیلت۔

اُوپر کا ہر افراطی خط سفہ یعنی چالاکی کہلائے گا اور وسطی خط

سے جو خط اوپر کو جتنا ہٹتا جائے گا اسی قدر کی رذالت بڑھتی جائے گی ۔ نیچے کا تفریطی خط بلہ یعنی حماقت کہا جائے گا اور جس قدر وسطی خط سے دور ہوتا جائے گا اسی قدر حماقت بڑھتی جائے گی۔

مابعد زمانہ کے اسلامی حکما کو چھوڑ کر جن کے پاس قیاس آرائیاں زیادہ تھیں اور علمِ حقیقت کم۔ صرف عہدِ رسالت کے باخبر حلقوں پر ایک نظر ڈالیئے اور تلاش کیجئے کہ ان میں حکیم کہلانے کا صحیح معنی میں مستحق کون ہے؟ ہم اس وقت تفصیل میں جانا نہیں چاہتے ورنہ نامور شخصیتوں میں سے ایک ایک کے افراطی اور تفریطی پہلوؤں پر روشنی ڈال دیتے اور یہ واضح کر دیتے کہ نظر و عمل میں کس کس نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ہمارے اور آپ کے فیصلہ سے یہ بہتر ہوگا کہ ہم اس فضیلت کے متعلق رسولؐ کا انتخاب آپ کے سامنے پیش کر دیں۔

حضرت کی مشہور حدیث ہے۔

انا دار الحکمۃ وعلیؑ بابھا

میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں

کیا علیؑ کے سوا یہ سند رسولؐ نے کسی اور کو بھی دی ہے؟

اس حدیث کو تسلیم کرنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوجائے گی کہ اسلام کی وہ حکمت جس کا گھر رسولؐ ہیں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ اسلام کے تمام حکما کو لامحالہ اسی در سے گزرنا ہوگا ورنہ وہ اسلامی حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ دُنیائے اخلاق و انسانیت پر اہلبیتؑ کا یہ احسان ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے کو بہ حیثیت ایک حکیم الٰہی کے پیش کر کے حقائقِ عالم پر صحیح روشنی ڈالتے رہے۔

انہوں نے اپنے سوانح حیات کو تنقید و تبصرہ کے لئے ارباب عقل و فہم کے سامنے پیش کر دیا ہے اور نکتہ چینیوں کو چیلنج دیا ہے کہ وہ پوری دماغی کاوش سے کام لیکر ان اعمال کو گرفت میں لائیں جو افراط و تفریط کی حدود میں داخل ہوں۔ علامہ علی ابن احمد دمشقی نے اپنے رسالہ "الحکمۃ والاسلام" میں کتنا صحیح کہا ہے۔

"حکمت کا جو راستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اسلام نے پیش کیا ہے، اقوام عالم کے قدم اس پر آنے سے کپکپاتے ہیں۔ اگر پیغمبر اسلام اس راہ کا جادہ پیما علی مرتضیٰ کو نہ بنا جاتے تو غالباً یہ ماننا پڑتا کہ یہ راہ ناقابل عبور ہے۔"

۲۔ عفت۔ حکمت کی طرح عفت بھی ایک وسطی خط ہے جس کا خطِ افراط غلبۂ حرص و ہوا اور نارواخواہشوں کی پیداوار ہے اور خطِ تفریطی جائز خواہشوں کا فنا کر دینا ہے۔ خط وسط سے بال بھر اونچا ہو جانا، افراطی معصیت کا شکار ہونا ہے اور بال بھر نیچا ہونا تفریط کا ہدف بنتا ہے بتائیے اس عفت کی سند کس کے ہاتھ میں ہے؟

مفسروں سے پوچھئے آیہ تطہیر کا نزول کس کی شان میں ہے؟ کیا اہلبیتؑ کے سوا کوئی اور گروہ معصوم بنایا جا سکتا ہے؟

کیا عہدرسالت کا کوئی دیندار مسلمان اس کا مدعی ہوسکتا ہے کہ وہ رجسِ ظاہری اور باطنی دونوں سے پاک ہے؟

دعوی کرنا آسان ہے لیکن ثبوت دینا مشکل۔

ہم دعوی سے کہتے ہیں کہ یہ فضیلت خاصہ ایک لفظِ مہمل، ایک خوابِ بے تعبیر اور فرضی ڈھکوسلا بن کر رہ جاتی اگر اہلبیت کا وجود دنیا میں نہ ہوتا۔

ادیانِ عالم اس اصطلاح سے ناواقف ہیں۔ مذاہبِ عالم اپنے پیشواؤں میں اس نور کی جھلک دکھانے سے قاصر ہیں۔

اس کی ناقص اقسام ایک کیا ہزاروں ابنائے روزگار میں پائی جاسکتی ہیں لیکن ہمیں ان سے بحث نہیں۔ ہماری نظر میں صرف وہ شخصیتیں ہیں جو عفت کے پیکر اور معصومیت کے مجسمے کہلاتی ہیں۔

ہر وہ دیندار مسلمان خواہ وہ کسی پایہ کا ہو کفر سے اسلام کی طرف آیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ عفت کا دیوتا عصمت کا فرشتہ کیونکر مانا جائے گا جبکہ اپنے بے شمار قدم وہ افراط و تفریط کی گذرگاہوں میں رکھتا ہوا چلا آرہا ہوگا۔

۳۔ **عدالت**۔ یہ بھی ایک درمیانی خط ہے جس کے اوپر ظلم ہے اور نیچے بزدلی سے بے موقع ظلم برداشت کرنا۔

واقعات سے لاعلمی، حقائق سے بے خبری، خودغرضی کے غلبہ اور بزدلی کے حد سے اکثر لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں نیتجہ میں

یا ظلم کرتے یا ظلم سہتے ہیں۔
کسی قضیہ میں حکم جب تک واقعہ کے مالہٗ وما علیہ سے من جمیع الوجوہ واقف نہ ہو وہ حق فیصلہ پر قادر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص احکام شرعی کا صحیح علم نہیں رکھتا وہ کوئی فیصلہ منشائے الہیٰ کے مطابق نہیں کرسکتا۔
یہ ملکہ بدرجہ اتم حضرت علی میں پایا جاتا تھا۔ اسکی تصدیق زبان ختمی مرتبت سے سُنئے۔ فرماتے ہیں اقضاکم علیؑ (تم میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علیؑ ہیں)
خلفائے ثلثہ کے عہدِ حکومت میں امیر المومنینؑ نے بے شمار ایسے قضایا فیصل کئے جن کا حل یا تو ان لوگوں نے اپنے قابو سے باہر پایا یا احکام الہی سے پوری واقفیت نہ ہونے کی بنا پر وہ غلط ہو جاتے تھے۔
حضرت عمر کا ستر بار لولا علیؑ لھلک عمر (اگر علیؑ فیصلہ کرنے والے نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا) کہنا اس کی دلیل ہے کہ علی علیہ السلام کا ہر فیصلہ مبنی بر عدل ہوتا تھا۔
عرب میں یہ مثل مشہور ہوگئی تھی قضیۃٌ وَلا اَبَاحَسَنٍ لھا یعنی قضیہ تو ہے مگر اس کے فیصلہ کرنے والے علیؑ نہیں۔
امیر المومنین نے حقوقِ مسلمین کی حفاظت میں جس عدل و انصاف سے کام لیا اس کی نظیر ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ اگر طول کا خوف نہ ہوتا تو ہم بے شمار مثالیں اس کے متعلق پیش کر دیتے۔
۴۔ **شجاعت**۔ سابق المذکر فضائل کی طرح یہ بھی وسطی خط پر قائم

ہے اس کے اُوپر کا افراطی حصّہ تہوّر کہلاتا ہے اور نیچے کا تفریطی حصّہ جُبن۔ یعنی خطِ شجاعت سے بال بھر اوپر کو قدم اٹھ جائے تو پھر وہ جاہلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ دلیری کہلائے گی اور اگر بال برابر نیچے اتر آئے گا تو پھر جُبن و بزدلی ہے۔ اس جادۂ اعتدال پر بمدت العمر قائم رہنا سوائے اہلبیتؑ کس کو نصیب!

انسانی تاریخ میں بہت سے بہادروں کے کارنامے ہماری نظر کے سامنے آتے ہیں۔ رستم، سہراب، اسفندیار۔ افراسیاب۔ بھیم۔ ارجن۔ ہرکلیس نپولین وغیرہ۔

بے شک وہ دلیر تھے۔ پُرجگر تھے۔ پُرزور تھے۔ جنگجو تھے لیکن ان میں تہوّر تھا، شجاعت نہ تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے قدم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹے، افراط و تفریط سے محفوظ رہے۔ ایک دو نہیں ہزاروں بار وہ ظلم و ستم کی ہولناک تاریکیوں میں لپٹے نظر آتے ہیں اور اکثر ایسا بھی کہ جُبن نے اُنکی گردن کی اکڑی ہوئی رگوں کو ڈھیلا کر دیا۔

دُنیا کے پُرشزور یا تو نام و نمود کے لئے لڑے یا فتوحاتِ ملکی کے سودے میں شمشیرزنی کی یا سلاطین سے انعام و اکرام لینے کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ہاتھوں سے بے شمار بے گناہ انسان مارے گئے۔ بے کس و بے بس عورتوں کی آبروریزی ہوئی۔ معصوم بچوں کی جانیں ضائع ہوئیں عزیز ذلیل ہوئے۔ کمزوروں پر تباہی آئی۔ ان کی کوئی ایک جنگ بھی انسانیت کی حمایت یا خدا کی خوشنودی کے لئے نہ تھی۔

حقیقی شجاع وہ ہے جو مقاتلہ کرتا ہے مگر جارحانہ حیثیت سے

نہیں بلکہ مدافعانہ طور پر۔ اپنے لئے نہیں بلکہ خوشنودی خُدا کے لئے۔ وہ سرکشوں کو ظلم پسندوں کو۔ خُدا کے منکروں کو، فتنہ پردازوں کو اس لئے قتل نہیں کرتا کہ اسے ملک و دولت کی ہوس ہے۔ جاہ و منصب کی آرزو ہے۔ تاج و تخت کی خواہش ہے بلکہ اس لئے تاکہ خُدا کی عاجز و ناتواں مخلوق کو شر پسندوں کے ظلم وستم سے بچائے۔ ملک میں امن و امان قائم کرے۔ کفر و شرک کی جڑوں کو کاٹے۔

شجاعت سے کیا تعلق ہے اس شخص کا جو کمزور کو ستاتا اور ناتواں پر، بے گناہوں پر اپنا زور آزماتا ہے، اسلامی تاریخ کی مدد سے بتائیے عہدِ رسالت میں کون مایۂ ناز بہادر تھا جس نے

(۱) راہ خدا میں جنگ کرنے سے کبھی گریز نہ کی
(۲) میدان میں جمے قدم نہیں ہٹائے
(۳) کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی
(۴) کفار و مشرکین کی لاشوں سے زمین کو پاٹ دیا
(۵) کبھی جارحانہ جنگ نہ کی
(۶) عورتوں، بچوں، بڈھوں اور ناتوانوں پر ہاتھ نہ اٹھایا
(۷) بے گناہوں پر تلوار نہ چلائی
(۸) بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا
(۹) پناہ لینے والے کو امان سے محروم نہ کیا
(۱۰) اپنے نفس کے لئے کبھی کسی سے جنگ نہ کی

(۱۱) مفتوحوں کے گھروں میں آگ نہ لگائی۔

(۱۲) مغلوب پر پانی یا رسد بند نہ کی

(۱۳) کھیتوں کو نہیں اجاڑا

(۱۴) بستیوں کو برباد نہیں کیا۔

بتائیے عہدِ رسالت کے من چلے جوانوں میں، دیندار شہ زوروں میں جنگ کے متوالوں میں ایسا کون تھا؟

دیکھئے اسلام کا سچا شجاع وہ ہے جس کو

خدا نے ذوالفقار عطا کی۔

اس کی بہادری دیکھکر ہاتفِ غیبی نے لافتیٰ الاّ علی کا نعرہ مارا۔ رسولؐ نے یوم خندق اس کی ایک ضرب کو عبادتِ ثقلین سے بہتر فرمایا۔ روزِ خیبر رسولؐ نے اس کو کرّار غیر فرار کا لقب دیا۔ اس کو خدا و رسولؐ کا دوست بیان کیا۔

اسلام کو اس ذات پر جتنا ناز ہو کم ہے۔ کیونکہ بنی نوعِ انسانی کی کوئی قوم، کوئی جرگہ، کوئی گروہ ایک بہادر بھی ایسا پیش نہیں کرسکتا جو کبھی اپنی قوتِ غضبی سے مغلوب نہ ہوا ہو۔ جس نے اپنی بدنفسی کو معرکۂ جنگ میں راہ نہ دی ہو۔ جس نے دشمن کے ساتھ بداخلاقی کا برتاؤ نہ کیا ہو۔

یہ اہلبیتؑ کا اسلام پر احسان ہے کہ انہوں نے کفار و مشرکین کے مقابل ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی برتری کو قائم رکھا اور ان کی مغرور گردنوں کو مسلمانوں کے مقابل کبھی اونچا نہ ہونے دیا۔

اہلبیتؑ اور غلام نوازی

بعثت ختمی مرتبتؐ سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عرب کے اندر غلام بنانے کی رسم جاری تھی اور غلاموں کے ساتھ وہ سنگدلی اور ناانصافی کا برتاؤ کیا جاتا تھا کہ الحفیظ والامان۔ غلام گویا ایک کاٹ کا پتلا یا فولاد کا پیکر تھا جس کی تکلیف کا کوئی احساس آقا کو ہوتا ہی نہ تھا۔ وہ تیلی کے بیل کی طرح شب و روز اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ آزادی کے تمام حقوق اس سے سلب کر لئے گئے تھے۔

اسلام نے بھی اس رسم کو باقی رکھا۔ جس پر دشمنانِ اسلام نے یہ طعنہ زنی کی کہ اسلام نسل انسانی پر ظلم و جور کا حامی ہے اور غلاموں کی فطری آزادی کا سلب کرنے والا ہے۔

یہ اعتراض شریعت اسلام کی اصولی حیثیت سے تو بالکل غلط ہے مگر رواجی اعتبار سے ایک حد تک صحیح بھی ہے۔

غلط اس بنا پر ہے کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعلق جو احکام نافذ کئے وہ درحقیقت ان کے لئے باعثِ رحمت تھے نہ کہ باعثِ زحمت۔ جو کفار و مشرکین میدانِ جنگ میں گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو مستقل قید رکھنے سے بدرجہا بہتر تھا کہ کسی مسلمان کی سپردگی میں دیکر ان کی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرایا جائے اور ان کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ بھی رکھا جائے

دربارِ رسالت سے آقاؤں کو تاکید کی جاتی تھی کہ اپنے غلاموں پر ظلم و ستم
ا نہ رکھیں۔ ان کی فطری آزادی سلب نہ کریں۔ ان کے جائز راحت و آرام میں
ل انداز نہ ہوں۔ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں۔
اگر وہ آزادی کے خواہاں ہوں تو ان سے معاہدہ طے کر کے آزاد کر دیں
ر بہت سے گناہوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی قرار دیا۔
غلام آزاد کرنے کے ثواب بیان کئے۔
اسلام کے یہ زریں اصول غلاموں کے لئے انتہائی راحت کا سبب
بن جاتے تھے۔ اور وہ اپنے آقا کے خاندان کی ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔ یہ
ی اس آزادی سے ہزار درجہ بہتر تھی جو حیاتِ انسانی کو تباہ کر دینے والی
ہے۔

زید بن حارثہ ایک جنگ میں قید ہو کر آیا اور اس کو آنحضرتؐ کی
ی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے اس غلام کے ساتھ وہ شفقت و مہربانی کا
تاؤ کیا کہ لوگ اس کو ابن رسولؐ اللہ کہنے لگے۔ قرآن نے اس کی تردید کی کہ محمدؐ
تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ خدا کے رسولؐ اور خاتم النبیین
ہیں۔

اسی زید بن حارثہ کا باپ اپنے گم شدہ بیٹے کو تلاش کرتا ہوا مدینہ آیا اور
اس سے مل کر دیر تک روتا رہا۔ آنحضرتؐ سے منت و سماجت کی کہ اس کا بیٹا
اس کے حوالے کر دیں۔ حضرت نے فوراً اس کو آزاد کر دیا۔ مگر زید باپ کے
ساتھ جانے پر راضی نہ ہوا۔

یہ تھی اسلام کی غلامی

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے: آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد اسلامی تعلیم کے نقوش لوگوں کے دلوں میں دھندلے پڑنے لگے اور ملکی فتوحات کا چرچا اور اس کے ضمن میں عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنے کا شوق ان میں پیدا ہوا تو جاہلیت کے رسم و رواج پھر عود کر آئے۔ اب غلاموں کی پھر وہی گت بننے لگی جس کا مختصر حال ہم بیان کر چکے۔

پس جن لوگوں نے عہدِ رسالت کی غلاموں پر شفقتیں نہ دیکھی تھیں وہ اپنے زمانے کے مسلمانوں کی سنگدلی دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ غلاموں کے ساتھ جو ناروا سلوک ہو رہے ہیں یہ سب اسلامی احکام کے ماتحت ہیں۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں جبکہ مسلمان آقا ایک مطلق العنان حاکم کی طرح غلاموں پر حکومت کرتے تھے اگر اہلبیتؑ میں سے کسی کا وجود نہ پایا جاتا تو عہدِ رسالت کی غلام نوازی کا نمونہ نکو کار مسلمانوں کو پیش کرنا ناممکن ہو جاتا کیونکہ وہاں تو ایک حمام میں سب ہی ننگے تھے۔

ائمہ اہلبیتؑ نے اپنے اپنے عہد میں غلاموں کے ساتھ جس رحم و ہمدردی اور انتہائی محبت و شفقت کا برتاؤ کیا۔ وہ نمونہ تھا عہدِ رسالت کی غلام نوازی کا اور اصولِ اسلام کی حفاظت کا۔

پس اہلبیتؑ کا یہ احسان فراموش کرنے کے قابل نہیں۔

اسلامی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں مسلمان آقاؤں کے برتاؤ غلاموں کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو پڑھ لیجیے آپ کو پتہ

جائے گا کہ اسلامی تعلیم سے وہ لوگ کتنے دُور تھے۔ اس کے ساتھ اس حسنِ سلوک پر نظر ڈالیئے جو آئمہ اہلبیتؑ اپنے غلاموں کے ساتھ کرتے تھے۔

تفصیل میں جانا باعثِ طوالت ہوگا۔ ورنہ ہم دکھلاتے کہ اہلبیتؑ کا برتاؤ غلاموں کے ساتھ کیسا تھا۔ مختصر طور پر سُن لیجئے۔

وہ پہلے غلاموں کو کھلاتے تھے بعد میں آپ کھاتے تھے

نیا لباس غلاموں کو دے دیتے تھے

ذرا ذرا سی بات پر کنیز اور غلام آزاد کر دیتے تھے

ان کے قصور سے چشم پوشی کرتے تھے

ہر قسم کی مراعات بخوشی ان کے ساتھ کرتے تھے

ان کی آزادی کے بہانے ڈھونڈتے تھے

حسنِ خدمات کا صلہ دیتے تھے

ان کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتے تھے

یہ تھی اہلبیتؑ کی غلام نوازی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے ایک غلام کو آزاد کرتے ہیں۔ وہ رونے لگتا ہے۔ سبب پوچھا تو اس نے کہا۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ میں آپ کے سایۂ عاطفت میں دیندارانہ زندگی بسر کروں؟

امام رضا علیہ السلام کا ایک غلام ہارون رشید کو پسند آتا ہے وہ آپ سے مانگ لیتا ہے۔ امام اجازت دیتے ہیں۔ وہ شاہی خدمات پر مامور ہو جاتا ہے۔ ایک روز حسنِ خدمت کے صلہ میں اُس نے کہا مانگ کیا مانگتا ہے

اس نے کہا امام رضاؑ کی خدمت۔

دیکھا آپ نے اہلبیتؑ کی غلام نوازی کو؟ کیا نسبت ہے اہلبیتؑ کو ان جبر پسند آقاؤں سے، جو خدائی احکام کو بھولے پڑے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کو طعن وطنز کے جو مواقع ملے وہ انہی نا عاقبت اندیش مسلمانوں کے ناروا کرتوتوں سے ملے اور اسلامی تاریخ کے اوراق ان ہی کی بداعمالیوں اور سیہ کاریوں سے سیاہ ہوئے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر اہلبیتؑ کا وجود نہ ہوتا تو رسولؐ کی زندگی کا نمونہ دُنیائے اسلام میں کہیں ڈھونڈے نہ ملتا۔

اہلبیتؑ اور اسلامی تبلیغ

زمانہ کی ناسازگاری، سلاطینِ روزگار کی بے توجہی اور بدگمانی نے اہلبیتؑ علیہم السلام کو کبھی کھُلم کھُلا تبلیغِ احکامِ اسلام کا موقع ہی نہ دیا۔ نہ وہ کسی شاہی درسگاہ کے ناظمِ اعلیٰ بنائے گئے۔ نہ کسی جامع مسجد کے خطیب؛ نہ کسی شہر کے مفتی یا قاضی؛ نہ کسی دربار کے عالم بلکہ انتہائی کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

ان کی تبلیغ کا دائرہ بہت محدود تھا۔ کیونکہ کسی بھرے جلسہ میں ان کو تقریر کی اجازت نہ تھی بلکہ مسجدوں میں بھی جو درس دیتے تھے جاسوسوں کے کان اس پر بھی لگے رہتے تھے اور چغلخوریاں کرکے بادشاہوں کو ان کے خلاف اُبھارتے

تھے۔ جو لوگ دور دور سے ان سے علمی فیوض و برکات حاصل کرنے کے لئے آتے تھے وہ سلطنت کے معتوبوں اور باغیوں میں شمار ہوتے تھے۔

غور کیجئے ایسے خوفناک زمانہ میں ان کی تبلیغ کا دائرہ کتنا وسیع ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود ان سب رکاوٹوں کے وہ اپنے فرض سے غافل نہ تھے۔ گم گشتگانِ وادیٔ ضلالت کی رہنمائی ان کا کام تھا۔ جس طریقہ سے بن پڑتا اس فرض کو انجام دیتے تاکہ حجتِ خدا اس کے نافرمان بندوں پر عام ہو جائے۔

ان کی دعائیں، ان کی مناجاتیں، ان کے مکالمے، ان کے خطبے حقائق و معارف کا قلزم بے پایاں ہوتے تھے۔ آج بھی یہ چیزیں دنیا میں موجود ہیں۔ خدا ان کو پڑھئے۔ کیا چیز ان کے اندر نہیں۔ الٰہیات کے متعلق بہترین درس ہیں۔ اخلاقیات کے اعلیٰ سے اعلیٰ سبق ہیں۔ معاشرت کے قابل قدر اصول ہیں۔ تمدن کے لائق تحسین آئین ہیں۔ عقاید فاسدہ کی تردید آیات کی صحیح تاویل و تفسیر ہے۔ دشمنوں کی مکاری، ظلم پسندی اور ریاکاری کی نقاب کشائی ہے۔ اپنے فضائل و مناقب کا بیان ہے۔ دنیا کی مذمت ہے۔ آخرت کی تعریف ہے۔ نکوکاری کی تلقین اور معاصی سے بچنے کی ترغیب ہے۔

ہر لفظ ایک قطرہ ہے، اور ہر قطرہ میں ایک بحرِ بے پایاں موج زن ہے۔ حقیقت شناسوں نے ان کے کلام بلاغت نظام اور فصاحت التیام سے اتنا لیا کہ وسعتِ دل و دماغ تنگ نظر آنے لگی۔ تعصب سے چندھیائی ہوئی آنکھ کیا دیکھے کہ ان کے اندر کیا ہے۔ مفلوج دل و دماغ کیا سمجھے کہ ہدایت کے دروازے خلق اللہ پر کس طرح کھولے گئے ہیں۔ انہیں مصیبتوں اور پریشانیوں

میں اہلبیتؑ کرام نے اپنی زندگی بسر کی اگر کوئی دوسرا ہوتا تو دماغی توازن کھو بیٹھتا اور اپنے اختلاج میں ہدایت کے فرض کو بھول جاتا۔ مگر وہ وہی تھے تلواروں کی باڑھوں میں، خصومت کے شعلوں میں، تعصب کے خارزاروں میں اسلام کی حمایت، شریعت کی حفاظت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود ان کی زندگی کا مقصدِ اولیں تھا۔

اسلامی احکام و آئین ہوس پرستوں اور غرض کے بندوں کے ہاتھوں میں جس طرح کھلونا بن رہے تھے، ایمان و عرفاں جس طرح بیدردی اور بے دینی کے پیروں سے کچلا جارہا تھا اس کو دیکھ کر ہرگز یہ امید نہ ہوتی تھی کہ یہ دین دینِ خدا اور یہ شریعت شریعتِ محمدؐ مصطفےٰ کہلانے کے قابل رہے گی۔

کیا کہنا اہلبیتؑ کرام کا کہ انہوں نے اس خوفناک سیلاب میں، ہولناک طوفان میں اسلام کی ہچکولے کھاتی کشتی کو سنبھالا اور جتنی جانیں بچائی جاسکتی تھیں بچائیں۔

وہ ہر زمانہ میں اسلام کی حقیقی تعلیم کو ابنائے روزگار کے سامنے پیش کرتے رہے اور اپنے عمل سے عملِ رسولؐ یاد دلاتے رہے۔ ماننا نہ ماننا دنیا والوں کا کام تھا۔

علمائے اسلام جب علمائے یہود و نصاریٰ یا مجوس اور دہریوں سے مباحثہ میں عاجز آتے تھے تو اس وقت اہلبیتؑ ہی کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ تاریخ اسلام میں ایک دو نہیں بیشمار وہ مناظرے درج ہیں جو آئمہ اہلبیتؑ نے دیگر ادیان کے علما سے کیئے۔

سلاطینِ بنی امیّہ اور بنی عباس جب کبھی مسئلہ کا حل علمائے اسلام کے قابو سے باہر پاتے تھے اور ان کے دل کی خلش کسی درباری عالم کے مٹائے سے نہ مٹتی تھی تو اس وقت اہلبیتؑ ہی یاد آتے تھے اور ان گتھیوں کو چٹکی بجاتے وہی سلجھاتے تھے۔

اہلبیتؑ کا صبر

آنحضرت ختمی مرتبت کی رحلت کے بعد ہی سے اہلبیتؑ مصائب و آلام کا شکار ہونے لگے۔ ان پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا گیا۔ معاملاتِ سلطنت ان سے بصیغۂ راز رکھے گئے۔ ان کی مالی حالت کو روز بروز کمزور سے کمزور تر بنایا گیا ان کے معاندوں اور دیرینہ حریفوں کو ان سے مقابلہ کے لئے طاقتور بنایا گیا۔ جمل و صفین و نہروان کی ان سے لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان کے دوستوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ برسر منبران پر تبرا کرایا گیا۔ ان کے متوسّلین کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ ان سے معاشرتی بائیکاٹ ہوا۔ ان کے احترام کو خاک میں ملایا گیا۔ ان کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ بغاوتوں کی آندھیاں اٹھائی گئیں۔ غرض تشدد پسندی اور ستم کیشی کے بازوؤں میں جتنی جان تھی وہ سب اہلبیتؑ کے خلاف کام میں لائی گئی اور عداوت کے ترکش میں جتنے تیر تھے وہ سب اہلبیتؑ کے بے کدورت سینوں پر تاک تاک کر مارے گئے۔

اگر پہاڑوں پر یہ مصائب پڑتے تو پانی کی طرح بہ جاتے اگر سینوں میں

فولاد کے دل ہوتے تو موم کی طرح پگھل جاتے واقعۂ کربلا کی نظیر آنکھوں کے سامنے ہے کون سا ظلم تھا جو باقی رہا تھا۔ کون سا پہلو عداوت کا تھا جو نمایاں نہ ہوا تھا۔ مگر یہ اہلبیتؑ کا کلیجہ تھا کہ سب منزلوں کو صبر کے ساتھ جھیلا۔ تلوار اگر اٹھی بھی تو صرف اُسی وقت جبکہ اس کے اٹھائے بغیر چارۂ کار نظر نہ آیا۔ دین کے بچانے کی اور کوئی تدبیر نہ دیکھی۔

یہ صبر، یہ ضبط محض اس لئے تھا کہ اسلام خانہ جنگی اور طوائف الملوکی سے برباد نہ ہو۔ کفار و مشرکین کو مذاق اڑانے کا موقع نہ ملے۔ اسلامی شیرازہ بکھر نہ جائے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق پر ضرب نہ پڑے۔ انہوں نے مسلمانوں کی بہبودی کو ہر حالت میں مدِ نظر رکھا۔ سخت سے سخت تکالیف کا سامنا خندہ پیشانی سے کر لیا۔ مگر یہ گوارا نہ ہوا کہ اسلامی نظم و نسق تباہ و برباد ہو جائے۔

اگر وہ کوشش کرتے تو ان کے تابعین کا ایک جم غفیر ان کے گرد جمع ہو سکتا تھا۔ نتیجہ جو کچھ ہوتا مگر اپنے دشمنوں پر کچھ مدت کے لئے تو عرصۂ حیات ضرور تنگ کر دیتے۔ کہیں نہ کہیں تو اپنی جد و جہد میں کامیاب ہو ہی جاتے کچھ نہ کچھ تو اپنے حقوق حاصل کر لیتے مگر وہ اپنے مفاد کو اسلامی مفاد پر قربان کرنے والے تھے انہوں نے اپنے کو مٹا دیا مگر افتراق بین المسلمین کا دھبہ اپنے دامن پر نہ لگنے دیا۔

اگر طلحہ و زبیر اور جناب عائشہ بصرہ میں اپنے لشکر نہ اتارتے اگر معاویہ ابنِ ابو سفیان کی فوجیں صفین کے میدان کو نہ بھر چکی ہوتیں تو امیرالمومنین ہرگز مسلمانوں کے مقابل تلوار نہ اٹھاتے۔ اگر یزید امام حسینؑ سے بیعت کا طالب

نہ ہوتا، ان کو آزادی سے حرمِ رسُول میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنے دیتا تو کربلا میں ان کو اپنی گرانقدر قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلبیتؑ سے زیادہ دُنیا میں نہ کسی نے صبر کیا ہے اور نہ قیامت تک کوئی کر سکے گا۔ بس ان کے صبر ان ہی کے ساتھ تھے۔

اہلبیتؑ کی قناعت

عَلَمِ اسلام کے سایہ میں آنے والے سب مسلمان یکساں نہ تھے۔ ان میں مومن بھی تھے اور منافق بھی۔ ضعیف الایمان بھی تھے اور مؤلفۃ القلوب بھی۔ اسلام کا فیض ہر شخص کو بقدر اس کے ظرف کے پہنچ رہا تھا۔

بکثرت ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کے عروج کی داستان کاہنوں اور راہبوں سے سن کر اپنی گنگا جمنی امیدوں کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے بہت سے ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے کے لئے آئے تھے۔

جب آفتابِ اسلام نقطۂ عروج پر پہنچا تو در پردہ خواہشوں نے اُبھارا کھایا۔ سوچی سمجھی ہوئی اسکیمیں اپنی کامیابی کی راہیں ڈھونڈنے لگیں عسرت و تنگدستی کی دَلقِ کہنہ بدن پر اور سوکھے ٹکڑے پیٹ میں شاق گزرنے لگے۔ حرص نے اپنے پیر پھیلانے شروع کئے۔ حلال و حرام کی تمیز اُٹھ گئی۔

اسلام نے حرص و آز کو قناعت کے زور سے پیچھے ہٹایا تھا مگر مسلمانوں نے قناعت و توکل کے سکڑے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر زرطلبی اور آرام جوئی

کے ان سبزہ زاروں میں گلگشت شروع کر دی جن میں زہریلی ناگنیں کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔

سچ پوچھئے تو جس چیز نے مسلمانوں کے ایمان کا خاتمہ کیا، روحانیت کی شمع کو گل کیا، دینداری سے دُور اور دُنیا پرستی سے قریب کیا، وہ مال و دولت اور جاہ و منصب کی خوفناک حرص تھی۔

اگر وہ قناعت پسند ہوتے تو بہت سی آنے والی مصیبتیں ان سے دُور رہتیں۔ آپس میں جھگڑے نہ ہوتے۔ خانہ جنگیوں کی نوبت نہ آتی۔ رشک و حسد کے شعلے نہ بھڑکتے۔ محبت کے سررشتے نہ ٹوٹتے۔ ظلم و ستم کی طرف رغبت نہ ہوتی۔ اخلاق میں پستی اور انسانیت میں ناہمواری پیدا نہ ہوتی۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ پہلی صدی ہی میں قناعت ایک بے معنی لفظ بن چکا تھا اور ایک قانع انسان کو اس عہد کا ذلیل ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

ایسے نازک دَور میں اس ملکۂ فاضلہ اور فضیلتِ کاملہ کی لاج رکھنے والے صرف اہلبیتؑ تھے۔ انہوں نے ان تمام لذات پر ٹھوکر مار دی جن پر لوگوں کی رال ٹپکتی تھی۔ وہ نہ دولت کے حریص تھے نہ جاہ و منصب کے۔ ہاں اگر حریص تھے تو عبادتِ الٰہی کے، تقربِ ایزدی کے، کمالِ نفس کے۔

ان کو قطعاً اس کی پروا نہ تھی کہ گھر میں کھانے کو ہے یا نہیں۔ جو وقت پر مل جاتا اسی پہ قناعت کرتے۔

مسلمان خواہ وہ پہلی صدی کے ہوں یا اس چودھویں صدی کے اگر قناعت

کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دیتے تو مسلمانوں کی خوبُو ان میں باقی رہتی۔ اہلبیتؑ کا یہ احسان تھا کہ وہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہے۔

اہلبیتؑ اور سیاست

اسلامی سیاست پر اگر تفصیلی روشنی ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اس مختصر رسالہ میں اتنی گنجائش کہاں۔ اس لئے ہم اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں سپردِ قلم کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی سیاست جب منصّۂ شہود پر آئی تو یہ دُنیا کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ جب سے انسانی تمدّن کا قیام ہوا سیاست اس کی بنیادوں میں داخل رہی۔ کسی تمدّن میں اس وقت تک امن وامان قائم نہیں رہ سکتا، حقوق الناس کی حفاظت نہیں ہوسکتی، ترقی کے ذرائع پیدا نہیں ہوسکتے جب تک سیاست کے صحیح اصول قائم نہ ہوں۔

ہر قسم کی سیاست کے لئے کچھ قوانین ناگزیر ہیں۔ اگر وہ مبنی بر عدل ہیں تو تمدّن میں ترقی ہوتی ہے اور رعایا میں خوشحالی پائی جاتی ہے ورنہ فتنہ وفساد کے ہاتھوں لوگوں کی عافیت تنگ ہوجاتی ہے۔

یاد رکھیے۔ قانون کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک اس کے نافذ کرنیوالے اچھے نہ ہوں گے بنی نوعِ انسان کے حقوق کی نگہداشت اس قانون سے ہو نہیں سکتی۔ خود غرض، غفلت شعار اور ظلم پسند حکمران اپنے ساتھ قانون کو بھی بدنام

کردیتے ہیں۔

قرآن حکومتِ الٰہیہ اور ریاست نبویّہ کا ایسا اٹل قانون ہے جس کی کوئی دفعہ قیامت تک بدلی نہیں جائے گی کسی ترمیم و تنسیخ کو اس میں دخل نہ ہوگا اور کیوں ہو جبکہ علام الغیوب خلاّق عالم کا بنایا ہوا ہے اور جو ایسا مبنی بر عدل انصاف ہے کہ ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مختلف قسم کی سیاستیں دُنیا میں پائی جاتی تھیں۔ ایرانی، یونانی، رومی، مصری، بابلی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قوانین بندوں کے بنائے ہوئے تھے جو ابنائے روزگار کے لئے تسلی بخش ثابت نہ ہوتے تھے۔

انہی پر کیا موقوف۔ ہر ملکی قانون چونکہ انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لئے قانون سازوں کی خودغرضی اور سلاطین کی خوشنودی بہت سی حق تلفیوں کا سبب بنجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن ایسے قوانین کے خلاف ایجی ٹیشن ہوا کرتے ہیں اور حکمران قوتوں کو ان میں ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی ہے۔

اسلام کا قانون جو خدائی قانون ہے البتہ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی ہے نہ ہوگی۔

آپ اسلامی قانون کا مقابلہ ہر زمانہ کے تمام سیاسی قوانین سے کریں بہت سی انوکھی چیزیں آپ کو اسلامی قانون میں ایسی ملیں گی جو دوسروں میں نہ ہوں گی۔

حکومتِ الٰہیہ یا ریاستِ نبویہ کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ (۱) اسلامی تمدّن کو فتنہ و فساد سے محفوظ رکھا جائے اور شر پسند عناصر کو اس تمدّن سے

قطعاً نکال باہر کیا جائے۔

(۲) انسانی حقوق کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ ذرہ برابر کسی پر ظلم نہ ہو اور کوئی زبردست کسی زیردست کو ستانے نہ پائے۔

(۳) بادشاہ اور رعایا میں ایسا رشتۂ اخوت قائم ہو کہ ایک کو دوسرے سے نفرت نہ ہو۔ بادشاہ رعایا پر اپنے تفوق و برتری کا اظہار نہ کرے اور رعایا اس کی نافرمانی کا خیال دل میں نہ لائے۔

(۴) اسلامی خزانہ بادشاہ کی ملکیت نہیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنے صرف میں لائے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ بادشاہ بقدر اپنے معینّہ حق کے اس میں سے خرچ کرسکتا ہے اس سے زائد ایک پائی نہیں۔

(۵) بادشاہ خدا کا ایک نمائندہ ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کی ہر تکلیف کو دُور کرے نہ کہ عیش و آرام میں پڑ کر ان کی طرف سے غافل ہو جائے اس سے قیامت میں اس کے متعلق بازپرس ہوگی۔

(۶) بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمّال و حکّام کے کام کی نگرانی کرے ان کے فیصلوں کی جانچ پڑتال کرے، ان کو عیش پرستی اور ہوس رانی سے روکے، رعایا کے ساتھ شفقت و محبت سے سلوک کرنے کی ہدایت کرے اور ان کی بداعمالی پر کڑی نکتہ چینی کرے۔

(۷) قانون کا نفاذ ادنیٰ و اعلیٰ سب پر یکساں ہو، تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

(۸) مجرم کی حیثیت عدالت میں برابر ہو چاہے وہ بادشاہ ہو یا ایک ادنیٰ

گداگر بے رو رعایت دونو کو سزا دی جائے۔

(۹) بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ خود بھی احکامِ اسلام کی پوری پابندی کرے اور دوسروں سے بھی کرائے۔

(۱۰) بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ حدودِ مملکت کی حفاظت میں پوری طاقت سے کام لے۔ صرف فوج و لشکر پر ہی اس کا بار نہ ڈالے بلکہ وقتِ ضرورت دشمن سے مقابلہ کے لئے خود بھی نکلے۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جن کو ہم نے بہت اختصار کے ساتھ لکھدیا ہے اب ذرا آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ رسولؐ کے بعد جو حکومتیں اسلام میں قائم ہوئیں۔ اُن میں کہاں تک احکامِ اسلام کی پابندی کی گئی۔

تاریخِ اسلام بتاتی ہے کہ آنحضرت کے انتقال کے بعد اسلامی حکومت کا رُخ رفتہ رفتہ اتنا بدلا کہ دُنیا کی عام حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت بھی ہوگئی۔

اسلام کا بادشاہ بھی قیصر و کسریٰ و خاقان و فغفور کی طرح زرنگار قصروں اور عالیشان محلوں میں حریر و دیبا کے پردوں کے اندر جا بیٹھا۔ مرصع تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ پُرتکلف مسندیں، جڑاؤ تخت اس کی جلوہ گاہ بنے۔ اس کے حرمِ سلطنت میں شراب کے دَور چلے حسینوں کے جھمگٹ ہوئے۔ سرود و ترانہ کی آوازیں گونجیں، عیاشی کا بازار گرم ہوا۔ عیش و عشرت کے دروازے کھلے، دروازوں پر چوکی اور پہرے بیٹھے۔ غلاموں اور کنیزوں کے ہجوم ہوئے سلطنت کے خزانے بادشاہوں کی ملکیت قرار پائے جور و استبداد حکومت کے آئین میں داخل ہوا۔ رعایا کے جذبات بے رحم بادشاہوں کی ٹھوکروں سے کچلے گئے۔

بے جرم و قصور رعایا کی گردنیں تلواروں کی دھاروں کے نیچے آگئیں۔
تن دلپسند ظلم و جور کے خوگر حکام غریب رعایا پر مسلط ہوئے۔ بادشاہوں کی بارگاہیں اتنی بلند ہوگئیں کہ کسی مظلوم کی فریاد اِن تک جا نہ سکی۔ عدل و انصاف کے دروازے بند ہوگئے۔ حق تلفی کوئی قابلِ مواخذہ جرم نہ رہا۔ مال و زر، جاہ و منصب کی حرص نے حلال و حرام کی تمیز اٹھا دی۔ اربابِ حکومت کی بدکرداریوں کی شکایت کرنا، گردن زدنی جرم قرار پایا۔

اہلِ انصاف بتائیں کیا یہ وہی سیاست تھی جس کو دُنیا میں خدا کے برحق رسولؐ نے قائم کیا تھا۔ کیا یہ وہی حکومت تھی جس کے آئین تعلیم کرنے کیلئے قرآن جیسی کتاب نازل ہوئی تھی۔ کیا فرمانروائی کے یہ وہی قواعد تھے جن کو رسولؐ نے اپنے عہد میں جاری کیا تھا؟ توبہ توبہ۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

ہاں اگر یہ مٹے ہوئے نقش کہیں اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے، یہ بھولی بسری باتیں کہیں یاد دلائی جائیں گی تو وہ اہلبیتؑ ہی کی حکومت ہوگی۔ تاریخِ اسلام کو پڑھئے۔ علیؑ کی چار سالہ حکومت کا انداز دیکھئے۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ اللہ والوں کی حکومت کیسی ہوتی ہے۔ اس حکومت کے ہر گوشہ میں حکومتِ الٰہیہ اور ریاستِ نبویہ کی شان نظر آئے گی۔ اس کے چپہ چپہ پر عدل و انصاف کی حکمرانی ہوگی۔ احکامِ قرآنی پر عمل ہوگا۔ آؤ ذرا دیکھیں علیؑ کی حکومت میں کیا ہو رہا ہے۔

(۱) عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی علیؑ اپنے بیٹوں کو حکم دیتے ہیں کہ بہت جلد کوفہ کی بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور اپاہجوں کی فہرست میرے

سامنے پیش کرو حسنینؑ اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اب مسلمانوں کا بادشاہ رات کو روٹیوں اور خرموں کے تھیلے اپنے کندھوں پر لاد کر نکلتا ہے اور ہر محتاج کے گھر پر جا کر تقسیم کرتا ہے۔ اس کی سلطنت کا بہترین مقصد یہ ہے کہ اس کی سلطنت میں کوئی مسکین و محتاج بھوکا نہ سوئے۔

(۲) دیکھیئے اسلام کا یہ بادشاہ نہ اپنے لئے کوئی قصر بنواتا ہے نہ تاج و تخت کا خواستگار ہے نہ خلعت شاہی کا متمنی۔ ایک چھوٹا سا حجرہ اس کا محل ہے۔ بوریا کا فرش اس کی مسند ہے۔ عربی عمامہ اس کا تاج ہے۔ سوکھی روٹی اس کی غذا ہے۔ پیوند دار کپڑے اس کا لباس ہے۔ دن کو روزہ اور رات کی عبادت اس کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے۔

(۳) اس کے سامنے تمام حکام سلطنت کی ایک فہرست ہے وہ اس کو غور سے دیکھ رہا ہے اور ان تمام عمال و حکام کے نام فہرست سے کاٹ رہا ہے جن کے کردار پر اس کو اعتماد نہیں جنکی ظلم پسندی اور رشوت خوری کے افسانے اس کے کانوں تک پہنچ چکے ہیں، جن کی بداخلاقی کی شکائتیں طشت از بام ہو چکی ہیں۔ یہ لوگ اس سے پہلے عیش کی بنسی بجا چکے ہیں۔ اب علیؑ کی حکومت میں ان کی ہوس رانی کو پیر پھیلانے کا موقع نہیں۔

(۴) دیکھیئے دربار میں اعلیٰ و ادنیٰ حکام کو بلایا گیا ہے۔ علیؑ اپنی حکومت کے آئین تعلیم فرما رہے ہیں۔

(۱) میری حکومت میں عدل و انصاف سے کام کرنا ہوگا۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں پر بے رو رعایت میرا عتاب نازل ہوگا۔

(۲) رشوت خوار حکام کو سخت سے سخت سزائیں دی جائینگی۔
(۳) ہر مظلوم کی فریاد رسی میرے حکام کا پہلا فرض ہوگا۔
(۴) میں ہر حاکم کی آمدنی اور خرچ کی جانچ پڑتال کروں گا۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے پر جواب طلبی ہوگی۔
(۵) حاکم کو حق نہ ہوگا کہ وہ رعایا کے یہاں دعوتیں کھلئے۔
(۶) حکام کو رعایا کی شکایت براہ راست سننا ہوگی۔
(۷) حکام شہر میں گھوم پھر کر رعایا کے حالات دیکھیں گے۔
(۸) بغاوت پسندوں کے سزا دینے میں کوئی رعایت نہ کی جائیگی۔
(۹) قاضیوں کو اپنے فیصلے پوری طرح غور و خوض سے کرنے ہونگے تاکہ کسی کا حق تلف نہ ہو۔
(۱۰) حکام کو اپنے تفوق و برتری کا خیال ترک کردینا ہوگا۔

(۵) علیؑ کے بھائی عقیل اپنی معاش کی قلت اور اولاد کی کثرت کا ذکر کرکے علیؑ سے اپنے وظیفہ میں کچھ زیادتی کے خواستگار ہیں۔ جواب ملتا ہے۔ سُنو عقیل! یہ خزانہ میرا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا ہے۔ مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کسی عزیز کو زیادہ دینے لگوں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو مجھے ملتا ہے اس میں سے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر تمہیں کچھ دیتا رہوں۔

(۶) علیؑ بیت المال میں رات کے وقت چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور حساب لکھ رہے ہیں۔ ایک شخص کچھ نجی باتیں کرنے آتا ہے۔ علیؑ چراغ گل کرکے اندھیرے میں اس سے گفتگو کرنے لگتے ہیں وہ اس کا سبب پوچھتا ہے تو فرماتے ہیں۔ اس

چراغ میں بیت المال کا تیل جل رہا ہے۔ مجھے کیا حق ہے کہ اپنی نجی باتوں میں میں اس کو صرف کروں۔

(۷) علیؑ ایک بار بازار سے گزر رہے ہیں۔ خلقت کا ہجوم ہے۔ آپ کو راستہ نہیں ملتا۔ ایک شخص مجمع کو یہ کہہ کر پکارتا ہے راستہ چھوڑو امیرالمومنین آ رہے ہیں۔ آپ اس سے فرماتے ہیں ایسا نہ کہو۔ عام لوگوں کی طرح اس وقت میں بھی اس بازار کا ایک خریدار ہوں۔

(۸) علیؑ کی زرہ چوری جاتی ہے۔ ایک یہودی کے پاس ملتی ہے حضرت علیؑ اس کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے جاتے ہیں وہ حضرت کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے کرسی خالی کر دیتا ہے۔ آپ اس کو ڈانٹتے ہیں کہ ایسا کیوں کیا۔ میں اس وقت بہ حیثیت ایک مدعی کے تیرے سامنے آیا ہوں نہ کہ بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے۔

(۹) ایک ضعیف عورت آٹے کی گٹھڑی لئے جا رہی ہے کمزوری سے سانس پھولا ہوا ہے۔ علیؑ اس کو دیکھتے ہیں۔ اس کی گٹھڑی لے کر اپنے کندھے پر رکھ لیتے ہیں اور اس کے گھر تک پہنچا آتے ہیں۔

(۱۰) آپ ایک سوتی کھیس اوڑھے ہوئے ہیں سردی زور کی ہے بدن کپکپا رہا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ امیرالمومنین آپ بیت المال سے ایک اونی دوشالہ کیوں نہیں لے لیتے؟ فرمایا بیت المال میرا نہیں۔ اس نے کہا فلاں ملک سے جو خراج آیا ہے اس میں تو آپ کا حق ہے اس سے خرید لیجئے۔ فرمایا اگر اس کام میں صرف کر دوں تو پھر محتاجوں کی امداد میں کہاں سے صرف کروں گا۔

(۱۱) دربار میں ایک عورت شکایت لے کر آئی کہ فلاں حاکم نے میرے لڑکے پر یہ ظلم کیا ہے کہ بے جرم و قصور اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔ آپ فوراً اس کے ساتھ جا کر اس حاکم سے جواب طلب کرتے ہیں۔ عورت کی شکایت حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔ آپ کا عتاب اس حاکم پر نازل ہوتا ہے اور اس کو عہدہ سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

(۱۲) آپ کو معلوم ہوا کہ کوفہ کی آبادی سے باہر ایک اندھا اپاہج پڑا ہوا ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس سے فرمایا تو بستی میں چل وہاں تیری خبر گیری آسانی سے ہو سکے گی۔ اس نے کہا میرے جوان بیٹے کی یہاں قبر ہے میں اس کو سینے سے لگائے پڑا رہتا ہوں۔ اس کو چھوڑنا گوارا نہیں۔ آپ نے اس کے جذباتِ محبت کا احترام کیا اور اپنا معمول کیا کہ ہر روز کچھ دینے کے لئے اس فقیر کے پاس جاتے اور اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلاتے۔

ایک دو نہیں اس قسم کے ہزاروں واقعات آپکے سوانح حیات میں پائے جاتے ہیں۔ اسلامی حکمران ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ حکومتِ الٰہیہ اور ریاست نبویہ کی شان یہ ہوتی ہے۔

یہ صرف اہلبیتِ رسولؐ ہی کی شان تھی کہ انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں احکامِ الٰہی سے سرمو تجاوز نہ کیا اور جو آنحضرت کی حکومت کی شان تھی اس کی صحیح تصویر ان مسلمانوں کو دکھا دی جو خدائی حکومت کے آئین کو سرتاسر بھلا بیٹھے تھے

اہلبیتؑ کی امن پسندی

اہلبیتؑ کو اپنی زندگی میں بہت سے مواقع پر انتہائی صبر و ضبط سے کام لینا پڑا۔ ان کی رگوں میں ہاشمی خون کھول کھول کر رہ جاتا تھا۔ ان کی شجاعت بھری نگاہیں رہ رہ کر قبضۂ شمشیر پر جاتی تھیں مگر وہ اپنی جنگ و پیکار سے مسلم حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ ایسی بے اثر ہستیاں نہ تھیں کہ ان کی آواز پر کوئی لبیک کہنے والا لبیک نہ پڑتا۔ باوجودیکہ زمانہ کی ناسازگاری نے ان کے حلقۂ اثر کو تنگ سے تنگ تر بنا دیا تھا۔ پھر بھی اسلامی ممالک کے گوشہ گوشہ میں ان کے بیشمار پیرو موجود تھے۔ اگر وہ اپنے اماموں کا ذرا سا اشارہ بھی پا لیتے تو گردنیں کٹوانے کو تیار ہو جاتے۔ مگر ان کی امن پسند طبیعت نے کسی وقت بھی جنگی محاذ قائم کرنا پسند نہ کیا۔

جس وقت امام زین العابدین علیہ السلام قید یزید سے رہا ہو کر مدینہ میں قیام پذیر تھے، عبداللہ بن زبیر نے انہیں اپنے ساتھ ملانے اور یزید پر خروج کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی مگر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے اور مسلمانوں کی خونریزی اور ملکی خلفشار کو پسند نہ فرمایا۔ غور کیجئے جب عبداللہ ابن زبیر خونِ حسینؑ کے انتقام کا پروپیگنڈا کر کے ہزارہا مسلمانوں کو اپنے علم کے نیچے لا سکتے تھے تو کیا امام زین العابدین علیہ السلام داستانِ کربلا سنا کر یزید کے خلاف کوئی

لشکر جمع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے؟

واقعۂ حرّہ کے بعد جو عام نفرت مسلمانوں میں یزید اور بنی امیہ کی حکومت کے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات بڑی طرح بھڑک رہے تھے بہت سے صحابہ مدینہ میں اس کے خواہشمند تھے کہ موقع ملے تو یزید پر خروج کریں۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے لئے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کا ایک اچھا موقع تھا جسے بھولے رہنے کے لئے ہلکا سا سہارا ڈھونڈا کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنی مظلومیت کی شان کو باقی رکھا اور ملک گیری کی ہوس اور امنِ عامہ میں خلل اندازی کا الزام اپنے اوپر آنے نہ دیا۔ وہ پوری طرح سمجھتے تھے کہ عوام کے جو جذبات اس وقت بھڑکے ہوئے ہیں ان میں حمایتِ دین کی اسپرٹ بہت ہی کم ہے۔

عباسیوں نے بنی امیہ کے خلاف جو صف آرائی کی اس کے متعلق ان کا پروپیگنڈا بھی یہی تھا کہ خونِ امام حسین علیہ السلام کا بدلہ لینا مقصود ہے حالانکہ یہ ایک آڑ تھی اصلی مقصد ملک گیری اور تمنائے تاج و تخت تھی۔ منصور دوانقی نے امام محمد باقر علیہ السلام کو اپنا ہم خیال بنانے اور اس جد و جہد میں شریک کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے صاف انکار کر دیا اور کھلے لفظوں میں فرما دیا کہ میں اس امر کی غرض و غایت کو اچھی طرح سمجھا ہوا ہوں۔

جب منصور نے تمام ساداتِ حسنی کو مقیّد کر کے کوفہ کے زندان میں ڈال دیا اور ان پر وہ تشدّد روا رکھے کہ سب کے سب قید خانوں میں مر کر رہ گئے۔ ہو سکتا تھا کہ اس موقع پر امام جعفر صادق علیہ السلام شمشیر بکف ہو جاتے اور آپ کے ساتھ لپکے

بہت سے بیرو بھی آمادۂ نبرد نظر آتے۔ چنانچہ اہل یمن کا ایک وفد آپ کی خدمت میں اس غرض سے آیا بھی مگر آپ نے ان سب کو صبر کی تلقین فرمائی اور کسی طرح جنگ پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

جس زمانہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بغداد میں مقید تھے۔ شیعان اہلبیتؑ نے آپ کے پاس خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم خلیفۂ وقت پر یورش کر کے آپ کو زندان سے رہا کرا لیں۔ مگر آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مرو میں جو مامون رشید کا دارالسلطنت تھا، اس کثرت سے محبان اہلبیت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کہ مامون رشید اور ارکان سلطنت کو یہ خوف پیدا ہو چلا تھا کہ امام کہیں ان کی مدد سے حملہ نہ کر دیں۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا یہ اور اس قسم کے بیشمار موقعے ائمہ اہلبیت کو جنگ کرنے کے مل سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی پیش قدمی کو روا نہ رکھا۔ ان کے سوانح حیات میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ انہوں نے ابتداً بہ جنگ کی ہو البتہ مدافعانہ جنگ ضرور کی۔ ایسی تمام لڑائیوں میں جو خونریز ہوئیں ان کا بار جنگ میں پہل کرنے والوں کے سر تھا نہ کہ ائمہ اہلبیتؑ کے۔

وہ امن پسند تھے اپنی طرف سے کسی وقت بھی کسی فتنہ کی آگ بھڑکانا نہ چاہتے تھے۔ گو اس امن پسندی میں ان کو سخت سے سخت مصائب جھیلنا پڑے مگر انہوں نے بخوشی ان کو برداشت کر لیا۔ اگر ایسے نازک موقعے کسی دوسرے کو پیش آتے تو اس کے ہاتھ سے صبر و ضبط کی باگ چھوٹ جاتی اور جو کچھ اس سے بن پڑتا کر گزرنا چاہے اس کے اس عمل پر دوسروں پر کیسی ہی سخت بلا نازل ہو جاتی

اہلبیتؑ کی ہدایتِ عامہ

یہ انسان کی فطرت ہے کہ اپنے دشمن کے ذلیل وخوار کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا اور اس کو پریشان کرنے اور تباہ و برباد کرنے کے لئے جتنا سامان فراہم کرسکتا ہے کرتا ہے۔ اس کے عیوب کو اچھی طرح طشت ازبام کرتا ہے۔ اس کو ایسے مشورے دیتا ہے جس سے اس کا بنا بنایا کام بگڑ جائے مگر یہ ائمہ اہلبیتؑ ہی تھے کہ انہوں نے مفید مشوروں سے اپنے کسی دشمن کو بھی محروم نہ کیا۔ جو شخص جس وقت اور جس حالت میں بھی ان سے ہدایت کا طالب ہوا انہوں نے بے تامل ہدایت کی اور کبھی یہ نہ چاہا کہ وہ کسی بلا میں مبتلا ہو جائے۔

یہ معمولی بات نہیں ہے کہنے کو کوئی کہدے کہ ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن اسکی عملی صورت اتنی دشوار ہے کہ سوائے خدا کے مخصوص برگزیدہ بندوں کے دوسروں سے ممکن نہیں ہوتا۔

اہلبیت علیہم السلام کا مقصدِ زندگی ہی خلق اللہ کو ہدایت کرنا تھا بس وہ اپنے اس فرض سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہو سکتے تھے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے مکہ کے قریب ایک کنواں کثیر مال صرف کر کے کھدوایا۔ جب کافی گہرا ہو گیا تو جو لوگ اس میں کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ یکایک وہ سب مر گئے۔ ان کی خبر لینے کے لئے جو اترتا گیا وہ مرتا

گیا۔ آخر مجبوراً کام بند کرنا پڑا۔ ہشام اور اس کے ارکان سلطنت اس معاملہ میں سخت متردد تھے۔ اور کسی کی سمجھ میں ان کی موت کا سبب نہ آتا تھا۔ آخر امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف رجوع کی گئی۔ باوجودیکہ وہ حضرت کی جان اور آبرو دونوں کا دشمن تھا۔ مگر آپ نے اپنی ہدایت کو روکا نہیں۔ فرمایا یہ وہ مقام ہے جہاں سابق زمانہ میں ایک قوم پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا ہے وہ ریح عقیم جس نے ان کو ہلاک کیا تھا اس کنوئیں سے نکل کر ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی ہے۔

ہشام نے کہا یا ابن رسول اللہ پھر کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا اس کنوئیں کو بند کرا دے اور فلاں مقام پر کنواں کھدوانے کا حکم دے۔ یہ ہوا وہاں تک نہیں پہنچی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ثابت ہوا۔

ایک دو کیا سینکڑوں ایسی مثالیں ائمہ اہلبیت کی تاریخوں میں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ہدایت دوست دشمن عام اور خاص سب کے لئے یکساں تھی۔

اہلبیتؑ کے کمالات

وہ تمام نفسانی اور روحانی کمالات جن سے انسان مدارجِ ترقی تک پہنچتا ہے۔ اہلبیت علیہم السلام میں جمع تھے۔ یہ اکتسابی چیز نہیں تھی کہ انہوں نے تدریجاً کسی مدرسہ میں کسی استاد سے تعلیم پا کر کوئی کمال پیدا کیا ہو بلکہ یہ سب کمالات ان کو سینہ بہ سینہ ایک امام سے دوسرے امام کو پہنچے تھے۔

ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے صرف ایک مثال دیکر اپنے اس

مدعا کو ثابت کرتے ہیں۔

ہشام بن عبدالملک نے کسی دشمنِ امام کے چغلی کھانے کی بنا پر اس غرض سے امام محمدؐ باقر علیہ السلام کو دمشق میں طلب کیا کہ وہیں ان کو روک لے۔ آپ کے ہمراہ آپکے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام بھی تشریف لے گئے۔ جس وقت دونو بزرگ ہشام کے دربار میں پہنچے وہ تیراندازی کی مشق کر رہا تھا اور اس کے ارکانِ سلطنت بھی اپنا اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ ہشام نے امام علیہ السلام کو اپنا کمال دکھانے کے لئے ایک نشانہ پر تین تیر مارے اور تینوں ٹھیک تھے۔ اب وہ امام کی طرف بڑھا اور حضرت کو ذلیل کرنے کیلئے کہنے لگا۔ لیجئے یہ کمان حاضر ہے آپ بھی نشانہ پر تیر لگائیں۔ فرمایا مجھے اس کی مشق نہیں۔ اس نے کہا آپ کو مشق کی ضرورت ہی کیا ہے آپ لوگ تو اس کے مدّعی ہیں کہ آپ بطنِ مادر سے ہر قسم کا کمال حاصل کئے ہوئے آتے ہیں۔ اس پر لوگ مسکرا دیئے۔

امام علیہ السلام نے کمان اس کے ہاتھ سے لے لی اور تیر کو نشانہ کی طرف سر کیا وہ ٹھیک اسی جگہ بیٹھا آپ نے دوسرا تیر پھر چھوڑا وہ پہلے تیر کے دوسرے سرے میں پیوست ہوا اور دونو تیر بدستور سیدھی لائن میں لگے رہے۔ آپ نے پھر تیسرا تیر مارا وہ دوسرے تیر کے آخری حصہ میں پیوست ہوا اور تینوں تیر بدستور ہوا میں معلّق رہے صرف پہلے تیر کی نوک دیوار کے اندر رہی۔

یہ کمال دیکھ کر ہشام مبہوت ہو گیا اور کہنے لگا یا ابن رسولؐ اللہ آپ نے یہ کمال کس سے سیکھا۔ فرمایا ہم تمہاری طرح دنیا والوں سے سیکھنے والے نہیں بلکہ ہمارا معلّم خالقِ واحد و یکتا ہے۔

اہلبیت کا اسلام پر یہ احسان تھا کہ وہ ایسے کمالات کا اظہار اپنی ذات سے کرتے تھے جس کی مثال لانے سے دیگر اقوامِ عالم کے باکمال عاجز ہو جاتے تھے۔

متوکل کے زمانہ میں ایک شعبدہ باز نے طرح طرح کے شعبدے دکھا کر اس کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ ایک دن متوکل نے اس شعبدہ باز سے کہا اگر تو اپنے کسی شعبدہ سے امام علیؑ نقی علیہ السلام کو شرمندہ کر دے تو میں تجھے ایک ہزار دینار انعام دوں گا۔ اس نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے آج آپ انہیں دسترخوان پر بلایئے اور چند چپاتیاں ان کے سامنے رکھوا دیجئے اور مجھے ان کے پاس بٹھا دیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب امام علیہ السلام نے ہاتھ بڑھا کر روٹی کو اٹھانا چاہا اس شعبدہ باز نے کوئی ایسا عمل کیا کہ وہ روٹی حضرت کے سامنے سے خود بخود ہٹ گئی۔ لوگ اس پر ہنس پڑے۔ اس بدبخت نے تین بار ایسا ہی عمل کیا حضرت کو غیظ آ گیا وہاں ایک فرش بچھا ہوا تھا جس پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی حضرت نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا پکڑ لے اس خبیث کو۔ یہ فقرہ زبان سے نکلنا تھا کہ وہ شیرِ قالین اصلی شیر کی صورت میں بن کر کھڑا ہو گیا اور اس شعبدہ باز کو نگل گیا۔ یہ دیکھ کر تمام مجلس لرز اٹھی۔ حضرت نے فرمایا جیسا تھا ویسا ہی ہو جا وہ پھر ویسا ہی ہو گیا۔

دیکھا آپ نے اہلبیتؑ کے روحانی کمالات کو۔ کیا یہ چیز مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر نہیں؟

اہلبیتؑ نے اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا

مخالفینِ اسلام ہمیشہ سے یہ پروپیگنڈا کرتے چلے آئے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ ایک پہلو سے تو یہ اعتراض بالکل غلط ہے اور دوسرے پہلو سے ایک حد تک صحیح۔

حضرت رسولِ خدا کے زمانہ میں اسلام کو جو ترقی ہوئی وہ بزورِ شمشیر نہیں بلکہ

(۱) اسلام کی حقانیت
(۲) دلائل کی مضبوطی
(۳) رسُولِ کریم کے اخلاقِ حسنہ
(۴) مسلمانوں سے انتہائی ہمدردی
(۵) مسلمانوں کا باہمی حسنِ سلوک
(۶) نیکوکاری کی تعلیم
(۷) بدکرداری سے نفرت
(۸) حقوق الناس کی حفاظت

وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں تھیں جو لوگوں کے دل اسلام کی طرف مائل کرتی تھیں۔ آپ کی کوئی جنگ جارحانہ نہ تھی بلکہ مدافعانہ تھی۔ آپ نے کبھی کسی کافر کو مجبور اکراہ مسلمان نہیں بنایا۔ بلکہ حقائقِ اسلام کو پیش کیا جس نے

مان لیا سبحان اللہ ورنہ اس کو جزیہ دینے پر مجبور کیا گیا اور یہ صرف ان کی حفاظت کا معاوضہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہزار ہا یہود و نصاریٰ آپ کی حکومت میں امن و امان سے زندگی بسر کرتے رہے۔

البتہ آپ کے بعد بعض سلاطینِ اسلام نے ملکی فتوحات کے سلسلہ میں ضرور جبراً لوگوں کو مسلمان بنایا یا وہ جان کے خوف سے مسلمان بنے۔

ہاں حضرت علی علیہ السلام کی حکومت اس سے مستثنٰی رہی ہے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے بھی کسی کافر کو جبراً مسلمان نہیں بنایا بلکہ جو طریقہ عہدِ رسولؐ میں تھا اسی کو باقی رکھا۔ انہوں نے ایک آنِ واحد کے لئے یہ گوارا نہ کیا کہ بزورِ شمشیر اسلام دُنیا میں پھیلایا جائے۔ وہ جانتے تھے

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ

دین میں جبر نہیں۔

خاتمہ

عقلِ انسانی اس سوال کا جواب طلب کرتی ہے

جب اہلبیتِ رسولؐ ہر قسم کے گناہ سے پاک و صاف تھے

جب ان کے اخلاق عام مسلمانوں کے اخلاق سے بہت بالا تر تھے

جب انہوں نے قابلِ قدر نصرتِ اسلام کی

جب انہیں اسلامی نظام سے ہمدردی تھی

جب انہوں نے بیشمار احسان اسلام پہ کئے
تو پھر مسلمان ان کے خلاف کیوں ہوئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا سب باتیں ان میں تھیں لیکن اس پہ اکثر مسلمانوں کا ان کے خلاف ہونا چند امور کی بنا پر تھا۔

(۱) جن مسلمانوں نے اہلبیتؑ کی مخالفت کی ہے وہ اپنی خودغرضی اور جاہ طلبی کی بنا پر نہیں چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت صرف خاندان اہلبیتؑ میں منحصر ہوکر رہ جائے بلکہ وہ خود اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حکومت کی حرص ان پہ غالب تھی۔ اسلام کے فروغ سے زیادہ ان کو اپنے نام ونمود اور تفوق و برتری کی فکر تھی۔

(۲) یہ مسلمان اچھی طرح اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ اگر اسلامی حکومت کی باگ اہلبیتؑ کے ہاتھ میں رہی تو ان کی دنیوی زندگی بے کیف ہوجائیگی زہد و تقویٰ کے تنگ راستہ میں توکل و قناعت کے سکڑے ہوئے جادہ پر انہیں بڑی احتیاط سے قدم رکھنا پڑے گا۔ وہ مالِ حرام نہ خود کھائیں گے نہ دوسروں کو کھانے دیں گے ان کی نظر میں دین کی فکر دنیا سے مقدم ہے۔ ایسی حالت میں حکومت کا کوئی لطف حاصل نہ ہوگا۔ بات بات پر گرفت ہوگی۔ ایک ایک معاملہ میں نکتہ چینی اور مواخذہ ہوگا۔ اس کو کون برداشت کرے گا۔ دُنیا کھانے کمانے کے لئے ہے نہ کہ کمل کھانے اور کمبل اوڑھنے کے لئے۔ لہٰذا جس طرح بنے ان زہد پسندوں اور تقوی شعاروں کے ہاتھوں سے زمامِ حکومت کھینچ لو۔

(۳) اہلبیتؑ کا روحانی اقتدار اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے سامنے دوسروں کا چراغ جلنا ناممکن تھا۔ پس اگر اس کو باقی رکھا جاتا تو عام مسلمانوں کے قلوب پر وہ لوگ اپنے احترام کا نقش نہیں جما سکتے تھے جو مال و دولت کے بھوکے اور جاہ و منصب کے حریص تھے۔ لہذا بہت غور و خوض کے بعد وہ اسکیمیں تیار کی گئیں جن سے ان کے اس روحانی اقتدار کا اثر رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کے دل سے مٹتا چلا جائے۔ آپس کی سازباز سے جن تجویزوں کو عملی جامہ پہنایا وہ یہ تھیں۔

(۱) مسلمانوں کا یہ عقیدہ بنایا جائے کہ رسولؐ کا جانشین بنانا خدا و رسولؐ سے متعلق نہیں بلکہ امت سے ہے۔

(۲) رسولؐ نے اپنا جانشین کسی کو نامزد نہیں کیا۔

(۳) رسولؐ ہو یا جانشین رسولؐ کسی کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں۔

(۴) اہلبیتؑ سے مراد تمام خاندانِ رسولؐ ہے جس میں تمام بنی ہاشم بلکہ تمام قریش بلکہ ازواجِ رسول تک شامل ہیں تاکہ جو احادیث فضائلِ اہلبیت میں ہیں وہ عام لوگوں سے متعلق ہو جائیں۔

(۵) آنحضرتؐ اپنی بعض ازواج کو اہلبیتؑ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

(۶) قرآن و حدیث کا صحیح علم یا بعض ازواج کو تھا یا بعض صحابہؓ کو اہلبیتؑ سے اس کی تخصیص نہ تھی۔

(۷) اہلبیتؑ کے فضائل بیان کرنے سے لوگوں کو روکا جائے تاکہ عوام بے خبر رہیں۔

(۸) ایسی احادیث کی غلط تاویلیں کی جائیں جن سے صراحۃً خلافتِ علیؑ اور دیگر ائمہؑ ثابت ہوتی ہو۔

(۹) حضرت علیؑ اور ان کی ذریت طاہرہ کے احسانات کو پردہ میں رکھ کر دوسروں کے اس قسم کے احسانات گھڑ کر عام مسلمانوں کے کانوں میں ڈالے جائیں۔

(۱۰) اہلبیتؑ کے مخالفوں کی مدح میں غلط احادیث بنوائی جائیں۔

(۱۱) اہلبیتؑ کی مالی حالت کو اس حد تک کمزور کر دیا جائے کہ کسی غریب مسلمان کو ان کے در پر جانے کا خیال ہی پیدا نہ ہو اور عسرت و تنگدستی کی شدت ان کو ہمیشہ پریشان حال رکھے۔

(۱۲) حکومت کے کسی شعبہ کا ان سے تعلق نہ ہو۔

(۱۳) کسی نمایاں مقام پر ان کو کھڑا کر کے امتیازی شان نہ دی جائے۔

(۱۴) دینی اور مذہبی شعبوں میں سے کسی شعبہ کا ذمہ دار ان کو نہ بنایا جائے۔

(۱۵) ان کی بجائے دوسروں کو امام بنا کر دینی خدمت ان کے سپرد کی جائے۔

(۱۶) ان کو تعلیم و تلقین کا موقع نہ دیا جائے۔

(۱۷) ان کے عمل کو عام مسلمانوں کے عمل کا مخالف بنا کر لوگوں کو متنفر کیا جائے۔

(۱۸) ان کے دوستوں کو ذلیل و خوار کیا جائے اور ہر قسم کا ظلم ان پر روا رکھا جائے۔

(۱۹) ان کی شکایتوں کو کان لگا کر نہ سنا جائے۔

(۲۰) ان کی حکومت میں بغاوت پھیلائی جائے تاکہ وہ سکونِ قلب سے کام نہ کر سکیں

(۲۱) ان کو سیاست میں کمزور اور مسجد کا صرف ایک ملا مشہور کیا جائے۔
(۲۲) حکومتیں ان سے کسی قسم کا کوئی تعاون جائز نہ رکھیں۔
(۲۳) ان کی ہر حرکت و سکون پر جاسوسانہ نظر رہے۔
(۲۴) ان کے عقاید کو نشر ہونے سے روکا جائے۔
(۲۵) عام مسلمانوں پر یہ ثابت کیا جائے کہ وہ اسلامی حکومت کے بدخواہ ہیں
(۴) مخالفین اہلبیت یہ سمجھتے تھے کہ اہلبیتؑ نے جو بے لوث اسلامی خدمت کی ہے، وہ ہمیشہ ان کو مرجع خلائق بنائے رکھے گی اور ہم کو ان کے سامنے اپنے اثرات قائم کرنے کا موقع نہ ملے گا لہذا ان کے احسانات کی فہرست پر جلد از جلد کسی طرح پانی پھیر دینا چاہیئے۔
(۵) چونکہ آنحضرتؐ کے بعد دینی امامت اور دنیوی حکومت کی ذمہ داری ایک ہی ذات پر ہوتی تھی جو خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا لہذا جب دنیوی حکومت کی باگ اہلبیتؑ کے ہاتھ سے چھین لی گئی تو ضرور ہوا کہ دینی امامت بھی ان سے ہٹائی جائے۔

بہر حال یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو اس امر کی محرک بنیں کہ اہلبیتؑ کو ان کی اصلی شان میں باقی نہ رکھا جائے اور ہر مسلمان کو اس درجہ ان سے متنفر کر دیا جائے کہ اگر وہ قتل بھی ہو جائیں تو کوئی اُف نہ کرے بلکہ ان کے روزِ قتل کو روزِ عید قرار دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا والوں نے ان کے مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر ان کا وہ روحانی جلال اور خداداد

اقتدار کہاں مٹ سکتا تھا جس کے باقی رکھنے کی ذمہ دار قدرت تھی۔ وہ ہر زمانہ میں آفتاب ہو کر چمکتا۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
کسے گر پف زند ریشش بسوزد

پاکستان حسینی مشن

کی

مطبوعات

(۱) اہلبیتؑ کا احسان	۸/
(۲) حکیمِ الٰہی علیؑ ابن ابی طالب	۱۲/
(۳) شاہزادۂ یثرب عالمِ ہجرت میں	۱۲/
(۴) مختصر اعمالِ ماہِ رمضان	مفت
(۵) بارگاہِ حسینیؑ میں عقیدت کے چند پھول	مفت
(۶) تعارف	مفت
(۷) مقتلِ ضحاک مشرقی	۵/
(۸) اہلبیتؑ اور اسلام	۸/

ملنے کا پتہ

(۱) ناظمِ اعلیٰ پاکستان حسینی مشن - پی ۷۴۰ اا سید پور روڈ راولپنڈی

(۲) پاک کتب خانہ - اردو بازار - راولپنڈی